ISSN 0974-7346

جولائی ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۷

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔ لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
* معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰ | ماہ ذی الحجہ ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۲۳ء | عدد ۷

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

ذی الحجہ کا مہینہ جہاں ایک ہجری سال کے خاتمہ کا اعلان کرتا ہے وہیں ایک نئے ہجری سال کے آغاز کی خبر بھی دیتا ہے۔ ہجری لحاظ سے یہ ۱۴۴۴ھ ہے۔ ۱۳۴۴ھ یعنی سو سال پہلے یہی ذی الحجہ اور یہی جولائی کا مہینہ تھا، گزرے ہوئے زمانہ کی جانب نظر کرنا محض ایک نفسیاتی کمزوری نہیں جس کو کچھ لوگ رومانی ماضی پرستی کا نام دیتے ہیں، بلکہ حکیم مشرق کی سنیں تو وہاں صلائے عام ہے، ع

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

بس اسی صدا کا اثر تھا یا ملک بلکہ پورا عالم جس گردش دوراں کا شکار ہے، کچھ دیر ہی کے لیے سہی، معارف کے اس شمارہ کا حال جاننے کی خواہش ہوئی جو ٹھیک سو سال پہلے ۱۳۴۴ھ کے ذی الحجہ کا تھا۔ معلوم ہوا کہ شذرات مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے تھے اور مضمون نگاروں میں مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، مولانا ابوالجلال ندوی، سید مظفرالدین ندوی، امجد حیدرآبادی، وحیدالدین سلیم اور خواجہ ممتاز تلمیذ حضرت داغ جیسے ناموں کا گویا سلسلہ زریں و جوہریں تھا۔ شذرات کا پہلا جملہ ذرا سی ترمیم کے ساتھ آج بھی سو سال کے فاصلے کا احساس نہیں ہونے دیتا کہ ''کیا خدا کی قدرت ہے کہ یورپ، اسلام کے چہرہ پر گرد و غبار ڈالنے کی جتنی زیادہ کوشش کر رہا ہے اسی قدر اس کا قدرتی حسن و جمال اور نکھرتا آتا ہے'' باب التقریظ والانتقاد میں اصغر گونڈوی کے مجموعہ کلام نشاط روح پر مولانا عبدالسلام ندوی کا تبصرہ ہے اور غضب کا ہے، لکھا کہ غزلیں ہیں جو غالب کے دیوان سے بھی زیادہ غیر مرتب طور پر جمع کی گئی ہیں۔ یعنی غالب کے دیوان میں تو صرف مطلع و مقطع ہی غائب تھے لیکن اس میں مطلع و مقطع کے ساتھ اکثر ردیفیں بھی غائب ہیں، اور جو موجود بھی ہیں ان میں بھی معلوم نہیں کس مصلحت سے نہایت بے ترتیبی پیدا کی گئی ہے۔ مجموعہ کے جامع کو اس کی معنوی خوبیوں نے اس قدر مبہوت کر دیا کہ ان کو اس کا ہوش نہیں رہا کہ باطنی خوبیوں پر حسن ظاہر کا بھی بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ مولانا ابوالجلال ندوی نے مستدرک حاکم مطبوعہ نسخہ حیدرآباد پر مبسوط مقام میں ایک جملہ اپنے دوست سید ہاشم ندوی کی ہمت افزائی کے جواز میں یہ لکھا کہ ندوہ نے ان کو تعلیم دی ہے کہ کام کرو مگر ستائشوں کی خواہش نہ کرو۔ مدیر معارف مولانا سید سلیمان اس وقت ارض حرم کی پاکیزہ معطر فضاؤں میں سانسوں کو نفحات قدسیہ میں بدل رہے تھے، مکہ معظمہ میں موتمر اسلامی کی وجہ سے سید صاحب نے ڈیڑھ ماہ قیام کیا، مدینہ منورہ میں بارہ دن رہے، یہاں طبیعت سیر نہ ہوئی تو حسرت ظاہر کی کہ ع

باز ہوائے چمنم کہ آرزوست

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک بارہ دنوں کا سفر طے کرنے میں بارہ دن صرف ہوئے، راستوں کا نشیب وفراز، پہاڑوں کا سلسلہ در سلسلہ، کہیں کوئیں، کہیں بدوؤں کے جھونپڑے، کہیں ببول کے درخت، کہیں ریگستان، کہیں سنگستان، عجیب عجیب منظر نظر سے گزرے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا فرق بھی عجیب نظر آیا کہ مکہ شان جلال اور مدینہ شان جمال کا مظہر ہوا، آب وہوا، جائے وقوع، آبادی، لوگوں کے اخلاق، علمی و تعلیمی حیثیت، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی ہر چیز میں فرق محسوس ہوا اور اس فرق نے دل کو لذت ہی دی۔

***

سوسال بعد جو کل عجیب تھا اب عجیب ترین ہو گیا، حج اور مناسک حج اور شعائر و حرمات حج میں آج بھی وہی قلب وروح کی لذت کا سامان ہے۔ اشہر معلومات اور ایام معلومات جیسی تعبیرات میں حج کی عبادت کو ایام معدودات سے ممتاز کرنے کا اشارہ تلاش کیا جاسکتا ہے۔ خوش نصیب تو ہر وہ شخص ہے جس کو ایمان اور پاکیزہ اعمال واطوار کی خو عطا کی گئی ہے، لیکن اس خوش بختی کا کیا پوچھنا جو بیت اللہ کے گرد پروانوں اور دیوانوں کی طرح پھیرے لگانے کا موقع دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے حجر اسود کے بوسوں کی حرارت اور زم زم کی شراب طہور کی لطافت سے لطف اندوز ہونے کی نعمت حاصل ہوتی ہے اور جہاں ربانی جلوہ گاہوں اور آسمانی کہکشاؤں سے بھی روشن تر راہوں پر بے چین مستانہ وار کبھی تیز اور کبھی خستہ روی کی شکل میں اس بے مثال بے قراری کا منظر سامنے ہوتا ہے جس کے درد اور اضطراب کی مثال شاید ہی تاریخ انسانی میں کہیں اور ملے، کیسی خوش قسمتی ہے کہ منیٰ اور عرفات کی محدود زمین کے لیے تمام وسعتیں کشادہ ہوتی دکھائی دیں، جن کو کامل سپردگی اور فدائیت کی رسم کی تجدید کے لیے وہی جگہ عطا کی جائے، جہاں چشم فلک نے حکم ربانی کی تعمیل میں جسم وجاں نثار کردینے کی سب سے انوکھی ادا کا نظارہ کیا تھا۔ حج کے واقف اسرار دماغ اسی لیے مسلسل کہتے رہے کہ بارگاہ الٰہی میں عاجزی اور درماندگی کا اظہار عبادت ہے اور حج میں یہ اظہار جس کامل طریقہ پر ہوتا ہے، اس کی مثال اور کہاں؟ غالباً اسی لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عمل کی قبولیت کا انداز بھی جدا ہے، وقوف عرفات میں عنایتوں اور لطف وکرم کی ربانی بارشوں میں جہاں ایک جانب اللہ کے منتخب بندے سرشار ہوتے جاتے ہیں وہیں شر اور فساد اور انسان سے عداوت کا سب سے بڑا مظہر شیطان سب سے زیادہ پیاسا، سب سے زیادہ جلا بھنا اور سب سے زیادہ مٹی میں ملا ہوتا ہے۔ خیر وشر کے امتیاز کو ہمیشہ سامنے رکھنے کے لیے رمی جمار کو یوں ہی لازم قرار نہیں دیا گیا۔ حج اور قربانی دونوں کا مطلوب تقویٰ اور کامل سپردگی یعنی اخبات ہے اور یہی اس ازلی وابدی

موسم بہار کی سوغات ہے۔اوراس سوغات کو بے نظیر بناتی ہے وہ ساعت جو سرور کائنات کے حضور پہنچا کر دنیامیں ایک مسلم کی خوش نصیبی کو معراجی شان عطا کرتی ہے۔ٹھیک سو سال پہلے کے ذی الحجہ نے آج کے ذی الحجہ کو خدا جانے کیا کیا یاد دلادیا۔

***

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے متعلق یہ متفقہ رائے ہے کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم ہے اور پچاس برس کے عرصہ میں افکار و نظریات اور طریقہ کار کے اختلاف کے باوجود بورڈ نے مسلمانوں کی متحدہ آواز کی حیثیت برقرار رکھی ہے۔عام طرز عمل اور رویوں کے برخلاف وقتی اشتعال اور سماجی و سیلابی جوش خروش کی جگہ ہوش، ثبات فکر و نظر اور متانت و وقار، بورڈ کا شعار رہا ہے،تو اس میں بورڈ کے اب تک نہایت نیک نام ذمہ داروں کا اثر ہے۔مولانا سید محمد رابع ندویؒ کی وفات کے بعد ان کی جانشینی کا وقت آیا تو شکر ہے، نہایت وقار و متانت کے ساتھ بورڈ کی نزاکتوں اور باریکیوں سے بخوبی واقف اور اس کے کار و معیار کو ہمہ وقت نظر کے سامنے رکھنے والے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کو بورڈ کا عہدۂ صدارت تفویض کیا گیا، مشکل حالات میں یہ اطمینان بخش فیصلہ ہے،دعا ہے کہ اللہ تعالی بورڈ کو اور اس کے نومنتخب صدر کو خیر و حکمت سے نوازے اور شر اور فتنوں سے ان کی حفاظت فرمائے۔

***

افسوس ہے کہ دارالمصنّفین کے نہایت مخلص اور سچے خیر خواہ مولانا مستقیم احسن اعظمی ایک طویل علالت کے بعد اپنے رب سے جاملے،انا للہ وانا الیہ راجعون۔مولانا جامع الصفات تھے،دیوبند،الاصلاح، الرشاد، ندوہ، دارالمصنّفین، جمیعۃ العلماء، ہر محراب و منبر ان کی صداؤں سے معمور رہا۔اعظم گڑھ مولد اور ممبئی ان کا معمل رہا۔خوش گفتاری و خوش اطواری بھی ان کی بڑی دلکش اور شخصیت کو باغ و بہار بنانے والی تھی۔اصلاحی خواص میں ایک طبقہ احسن کی صفت سے معروف ہوا، اختر احسن، امین احسن، جلیل احسن، صغیر احسن وغیرہ، مولانا شاید اسی احسنیات کی آخری علامت تھے۔اللہ مغفرت فرمائے۔

***

مقالات

مالک رام کا اسلامی نظریہ فکر

محمد قاسم

ریسرچ اسکالر، الٰہ آباد یونیورسٹی

qasimmohammad991@gmail.com

مالک رام (م: ۱۹۹۳ء) کا پسندیدہ اور محبوب موضوع اسلام اور اس کا مطالعہ ہے۔ بچپن ہی سے ہندو اور سکھ مذہب کے ساتھ ساتھ اسلام کے بارے میں ان کو جاننے کا شوق تھا۔ انہوں نے اپنے گاؤں کی مسجد کے امام سے اردو اور عربی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہب اسلام کی بنیادی تعلیم حاصل کی۔ مالک رام کے بچپن کے دوست محمد باقر لکھتے ہیں:

> مالک رام نے اسلامی علوم و ادب سے اپنا رابطہ بچپن میں اپنے گاؤں پھالیہ (ضلع گجرات) کے امام مسجد کے توسط سے قائم کیا۔[1]

بچپن کے اس شوق کا اثر یہ ہوا کہ انہیں بعد میں مذہبی کتابوں سے خاص تعلق ہو گیا۔ پھالیہ کے ورنا کولر مڈل اسکول میں سیکڑوں کتابوں کے مطالعے کے دوران اسلامی کتابوں سے واقفیت بڑھی، مطالعہ وسیع ہوا۔ اس مطالعے میں ان کے یار و مددگار ملک احمد حسین رہتاسی تھے جو ان کے دوست تھے اور ہم جماعت بھی تھے۔ وہ اسلامیات سے متعلق بہت سی کتب پڑھنے کے لیے لا کر دیتے۔ اسی زمانہ میں رسالہ ''نگار'' بھی نکلتا تھا، جس کے ہر شمارے میں نیاز فتح پوری کا اسلام اور قرآن سے متعلق مضمون ضرور ہوتا تھا، مالک رام نگار کے مستقل قاری تھے، اس لیے اسلام اور قرآن کے تعلق سے ان کے شوق مطالعہ کو جلا ملی۔ جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لیے لاہور گئے تو وہاں ایک عالم سید دلاور شاہ بخاری سے دو برس تک قرآن شریف کے اٹھارہ پارے پڑھے اور باقی کے بارہ پارے خود ہی مکمل کیے۔ مالک رام لکھتے ہیں:

---

[1] محمد باقر ''مالک رام میرا دوست اور انسان دوست''، مشمولہ ارمغان مالک، مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مجلس ارمغان مالک، نئی دہلی ۱۹۷۱ء، ص ۸۶۔

میں جب ۱۹۲۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور پہنچا تو مجھے خیال آیا کہ قرآن پڑھنا چاہیے۔اس کا شوق میرے دل میں اس سے پہلے اردو میں اسلامی کتب کے مطالعے سے پیدا ہو چکا تھا۔خوش قسمتی سے ایک دوست کے ذریعے سے اس کا مناسب انتظام ہو گیا۔ایک عربی دان عالم دین نے مجھے پڑھانے کی حامی بھر لی۔میں نے دو برس تک ان کی خدمت میں گرمی، جاڑا، بلاناغہ قبل فجر حاضری دے کر پہلے اٹھارہ پارے پڑھے۔بد قسمتی سے اس کے بعد بوجوہ یہ سلسلہ ٹوٹ گیا اور بقیہ مجھے اپنے سے مکمل کرنا پڑا۔[۲]

۱۹۳۲ء میں مالک رام آریہ سماج کے ہفتہ وار ترجمان ''آریہ گزٹ'' کی ادارت سے منسلک ہو گئے۔اس وقت ہندوستان میں اور پنجاب میں خاص طور سے مذہبی مناظروں کا شور تھا۔اس ماحول کا مالک رام پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے مختلف مذہبوں یعنی اسلام ،ہندو اور عیسائی مذہب کا تقابلی مطالعہ شروع کر دیا۔۱۹۳۹ء میں وہ ملازمت کے سلسلے میں مصر گئے اور اسی ملازمت کے دوران انہوں نے اس طرح مصر، عراق، ایران، شام، فلسطین، سوڈان اور افغانستان وغیرہ میں بھی وقت گزارا۔اس طرح عربی پڑھنے، سمجھنے اور سیکھنے کا بہترین موقع ملا، جس سے ان کے لیے قرآن مجید اور علوم اسلامیہ سے استفادہ آسان ہو گیا۔اس کا اثر اسلامیات کے موضوع پر ان کی دو عمدہ کتابوں ''عورت اور اسلامی تعلیم'' اور ''اسلامیات'' کی شکل میں سامنے آیا۔

اسلامیات کے موضوع پر ''عورت اور اسلامی تعلیم'' ان کی پہلی کتاب ہے جو نگار بک ڈپو لکھنؤ سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔اس سے پہلے اس کے تمام مضامین رسالہ ''نگار'' میں شائع ہو چکے تھے۔عورت اور اسلام جیسے موضوع پر مالک رام کو داد تحقیق دینے اور قلم اٹھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟اس سوال کا جواب خود مالک رام نے کتاب ''وہ صورتیں الٰہی'' میں تفصیل سے دیا ہے۔لکھتے ہیں:

۱۹۳۲ء یا شاید ۱۹۳۳ء کی بات ہے، میں نے مطالعے کے اثنا میں محسوس کیا کہ قرآن میں عورت کی زندگی سے متعلق بہت تفصیلی تعلیم دی گئی ہے لیکن یہ کسی ایک مقام پر نہیں بلکہ مختلف سورتوں میں منتشر حالت میں ملتی ہے،جی میں آئی کہ کیوں نہ اسے یکجا کر کے اس پر ایک مضمون لکھا جائے۔میں نے نیاز صاحب کو اپنے اس ارادے کی اطلاع دی اور یہ بھی درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو عنوانات مقرر کر دیجیے جن کی روشنی میں یہ مضمون مرتب کر دوں۔انہوں نے جواب دیا کہ فہرست عنوانات خود تیار کیجیے۔اس سے چند مہینے پہلے رسالہ جامعہ (دلی) میں

---

[۲] مالک رام،اسلامیات، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی ۲۰۱۱ء، ص ۸۔

کسی کا ایک مضمون اسی موضوع پر شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اسے دیکھنے کی بھی ہدایت کی۔ غرض میں نے عنوانات مقرر کر کے ان کی خدمت میں بھیج دیے۔ انہوں نے ان سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ جب مضمون مکمل ہو جائے تو اسے نگار میں اشاعت کے لیے بھیج دیجیے۔[۳]

نیاز فتح پوری نے مسودہ واپس کیا تو مالک رام نے ان کی اجازت سے معارف کے مدیر مولانا سید سلیمان ندوی کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیج دیا۔ انہوں نے مضمون کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا ہے کہ مضمون کس کا لکھا ہوا ہے تو میں اسے پڑھ کر یہی خیال کرتا کہ یہ کسی مسلمان عالم نے لکھا ہے۔[۴]

مولانا سید سلیمان ندوی نے بعض مسائل کے بارے میں لکھا کہ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو تفصیل سے بات چیت کریں گے۔ جب مالک رام بسلسلہ ملازمت مصر چلے گئے تو کتاب کا مسودہ مولانا سید سلیمان ندوی کے پاس ہی تھا، بعد میں ملک احمد حسن کے ذریعہ مالک رام کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے مزید مطالعہ و تحقیق کے بعد بعض مشمولات پر نظر ثانی کی۔ کتاب کا آخری باب جو "عورت مذاہب عالم میں" کے عنوان سے تھا۔ اس کو انہوں نے ۱۹۴۵ء میں "عورت اور اسلام" کے عنوان سے "نگار" کے تین شماروں میں شائع کرا دیا۔ بعد میں نیاز فتح پوری کے تعارفی کلمات کے ساتھ یہ سارے مضامین "عورت اور اسلامی تعلیم" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

تعارف، دیباچہ اور عرض مولف کے بعد کتاب پانچ ابواب میں تقسیم ہے جن میں عورت کو اس کی مختلف حیثیتوں سے جیسے بیٹی، بیوی، ماں، مطلقہ، بیوہ اور وارثہ کے لحاظ سے موضوع بحث بنایا ہے۔ چونکہ عورت کی زندگی کا آغاز بیٹی ہی کے طور پر ہوتا ہے، اس لیے آغاز بیٹی کے ذکر سے ہے۔ عربوں میں دختر کشی عام تھی۔ لڑکیوں کی پیدائش کو باعث ننگ خیال کیا جاتا۔ اسلام نے اس غلط خیالی کو دور کیا۔ اسلام نے لڑکے اور لڑکی کی تعلیم و تربیت میں بھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا بلکہ دونوں کے لیے تعلیم کا حاصل کرنا لازمی قرار دیا۔ ان بنیادی نکتوں پر مفصل بحث کے بعد مصنف نے لڑکیوں کی اندرون خانہ زندگی، استیذان، بیرون خانہ زندگی اور پردہ اور یتیموں کی نگہداشت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور یہ مکمل قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں ہے۔ گھر، باہر، پردہ، یتیم بچیوں کا مسئلہ یہ سب نہایت علمی انداز

---

[۳] مالک رام، وہ صورتیں الٰہی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۰۴۔
[۴] ماخذ سابق ص ۲۰۵۔

میں پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا باب عورت بحیثیت بیوی کے عنوان پر ہے۔اس میں ۳۶ ذیلی عناوین ہیں۔ازدواجی زندگی کے مسائل زیادہ ہیں۔اس لیے قدرتاً یہ باب طویل ترین ہے۔اس میں نکاح کے مقاصد، محرمات، نکاح ،تعدد ازواج اور اس کی شرائط ،بیوی کے حقوق اور فرائض ،اعلان نکاح ومہر، حسن معاشرت اور ترتیب اولاد وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تمام مسائل قرآن وحدیث کی روشنی میں ہیں ؛تاہم مصنف نے اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے۔اس باب میں نکاح کے تین مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔پہلا زوجین کے درمیان الفت و محبت،دوسرا بقائے نسل اور تیسرا انسداد فسق ومعصیت ہے۔اس بحث میں فحش،زنا اور اس کی مختلف سزائیں جیسے کوڑے لگانا، سنگسار کرنا، اخراج کرنا، چار گواہ اور لعان وغیرہ پر مفید گفتگو آگئی ہے۔اسی حصے میں نکاحِ متعہ پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

> غرض اسلام کے نزدیک عارضی اور معینہ مدت کا نکاح جائز نہیں۔اس میں صرف ایک ہی صورت کی اجازت ہے کہ عورت اور مرد سوچ سمجھ کر رشتہ ازدواج میں بندھنے پر تیار ہوں اور اس کی ساری ذمہ داریوں کو خوشی سے برداشت کریں، نہ کہ ان سے بچاؤ کے لیے حیلے تلاش کرنے کی سعی کریں۔[۵]

تعدد ازواج پر بحث ہونی ہی تھی۔اسلام میں چار شادی کی اجازت کیوں ہے؟ کن حالات میں ہے؟اس کی شرطیں کیا ہیں؟ بہتر شکل کیا ہے؟ان تمام سوالوں کے جواب عمدہ پیرایہ میں قرآن وحدیث کی منشا کے مطابق پیش کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ باندی، مشرک، کافر اور اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی حرمت اور جواز بھی بیان کیے ہیں۔ باندی سے نکاح پر بحث کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

> اسلام نے لونڈیوں سے نکاح کی اجازت دے کر یہ بتادیا ہے کہ دراصل تم سب ایک نسل انسانی سے ہو، بہتر یہ ہے کہ تم انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لو تاکہ دونوں ایک سطح پر آجاؤ۔ چنانچہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت رسول کریم ﷺ کا یہی دستور تھا۔ اسلام چاہتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں کی وقعت اور عزت اور معاشرتی درجہ بھی بڑھے۔اسی لیے حدیث میں فرمایا کہ انہیں تعلیم دو، آداب سکھاؤ اور آزاد کر کے ان سے نکاح کر لو۔(بخاری، کتاب العلم)۔[۶]

آخر میں بیوی کے حقوق و فرائض بیان کیے گئے ہیں۔ جس میں حسن معاشرت، نان ونفقہ، اعتماد، اطاعت

---

[۵] مالک رام، عورت اور اسلامی تعلیم، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۸۸۔

[۶] ماخذ سابق، ص ۹۷۔

شعاری، حقوق کی حفاظت اور تربیت اولاد وغیرہ پر شرح وبسط سے بحث کی ہے۔

تیسرے باب میں عورت کو بحیثیت "ماں" کے پیش کیا گیا ہے اور ماں کی اہمیت اور اس کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔ دنیا کے ہر معاشرہ و مذہب میں والدین کی عزت و خدمت کی باتیں ملتی ہیں مگر قرآن نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر جس تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس کو مالک رام نے اہمیت سے بیان کیا اور سورۃ بنی اسرائیل کی اس آیت کو پیش کیا جس سے زیادہ طاقتور اسلوب میں والدین کی خدمت کا ذکر کہیں نہیں ملتا کہ:

> اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو اور والدین سے حسن واحسان سے پیش آؤ۔ اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے کبر سنی کو پہنچیں تو ان سے کبھی اف تک نہ کہو اور نہ ہی ان سے کبھی سختی سے پیش آؤ بلکہ دونوں سے نرمی اور ادب سے گفتگو کرو اور ان کے لیے دل میں جذبات رحم لیے ہوئے عاجزی اور فرمانبرداری سے جھک جاؤ اور دعا کرو کہ اے میرے رب! جیسے انہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی تھی اس طرح اب ان دونوں پر رحم فرما۔[7]

چوتھا باب "مطلقہ۔بیوہ" کے عنوان سے ہے۔ جس میں طلاق، عدت، طلاق کی قسمیں، حلالہ اور خلع وغیرہ پر قرآن وحدیث کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر مالک رام لکھتے ہیں کہ بظاہر لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام میں طلاق بہت آسان چیز ہے مگر ایسا سوچنا غلط ہے۔ کیونکہ اسلام میں طلاق انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔ لکھتے ہیں:

> قرآن نے طلاق پر کئی پابندیاں لگائی ہیں اور اس کی یہ کوشش ہے کہ جہاں تک ہو سکے خاوند اور بیوی میں جدائی نہ ہو اور وہ آپس میں صلح کر لیں۔ ہاں! اگر وہ کسی طرح بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو سکیں تو اجازت دی کہ اس صورت میں طلاق دے دی جائے۔[8]

مصنف خلع اور اس کے قانون وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا:

> اسلام نے عورت کو خلع کا حق دے کر اس پر بہت بڑی ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ اس لیے چاہیے کہ وہ اس کے استعمال میں نہایت درجہ احتیاط سے کام لے۔ ثوبانؓ سے روایت ہے کہ جو عورت

---

[7] ماخذ سابق، ص ۱۴۲۔

[8] ماخذ سابق، ص ۱۴۹۔

بلاوجہ اپنے شوہر سے خلع چاہتی ہے اس پر جنت حرام ہے۔(ترمذی،ابوداؤد،ابن ماجہ)ایک اور جگہ بار بار خلع طلب کرنے والی عورتوں کو منافق قرار دیا ہے۔(نسائی)[9]

پانچواں اور آخری باب ''وراثت'' سے متعلق ہے جس میں اصول وراثت،اصول وصیت،قرض،اولاد اور والدین اور میاں بیوی کے حصوں کا بیان ہے۔ معیشت کے اصول بتانے کے بعد مالک رام نے وصیت اور اس کے وصول اور قرض اور اصول وراثت اور اس کی تقسیم،اولاد اور والدین کے حصے،میاں بیوی کے حصے اور کلالہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور بعض اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے۔ جیسے:

یہ اعتراض قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔حصے لڑکی اور لڑکے کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر مقرر کیے گئے ہیں،عورت کا متکفل مرد ہے،مرد کا فرض ہے کہ وہ بیوی اور اولاد پر خرچ کرے۔اس کے مقابلے میں عورت چاہے تو اپنی ذاتی ضروریات پر بھی کچھ نہ خرچ کرے،یہ اس مرد سے مہیا کرے گا۔ پس مرد کا حصہ زیادہ اس لیے رکھا کہ اس کی ذمہ داری زیادہ ہے،اور عورت کا حصہ کم اس لیے رکھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی ذات کے علاوہ کسی اور پر خرچ کرنے پر مجبور نہیں۔[10]

مالک رام کی دوسری کتاب ''اسلامیات'' کے نام سے ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آئی۔چھ مقالوں پر مشتمل یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔اس کتاب سے مالک رام کی اسلامی امور میں بصیرت،تدبر اور تفکر کا پتہ چلتا ہے۔''لاالٰہ الاللہ محمدرسول اللہ''، الاسلام،اسلامی خلافت، خلق عظیم،افصح العرب اور عورت مذاہب عالم میں کے عنوان سے یہ مقالات مالک رام کی تحقیق و تلاش کی دلیل ہیں توزور استدلال،بالغ نظری اور قوت استناد کی بناپر غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

کلمہ توحید کی اہمیت انہوں نے خوب واضح کی ہے۔کلمہ میں اللہ کے ساتھ رسول کے ذکر پر انہوں نے کچھ اعتراضوں کا ذکر کیا ہے۔ جیسے گنگا پرشاد اُپادھیائے نے ''مصابیح الاسلام'' میں لکھا:

جب ہم کہتے ہیں کہ محمد صاحب ہمارے رسول ہیں اور اس جملے کو اللہ کے کلمہ کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں تو حضرت محمد صاحب ہماری بات سنتے نہیں۔اللہ کے تصور کے ساتھ محمد صاحب کا بھی تصور ہمارے دل کے سامنے آجاتا ہے،پھر توحید کہاں رہی؟۔[11]

---

[9] ماخذ سابق،ص ۱۷۷۔

[10] ماخذ سابق،ص ۲۰۵۔

[11] مالک رام،اسلامیات، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی ۲۰۱۱ء،ص ۲۰۔

مالک رام نے گنگا پرشاد اپادھیائے ہی نہیں ان جیسے تمام مخالفین کا سخت لیکن بڑا منطقی جواب دیا۔ لکھتے ہیں:

یہ (اعتراض) قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ کلمہ خدایا اس کے رسول کو سنانے کے لیے نہیں پڑھاتا۔ بلکہ یہ اپنے ایمان اور اعتقاد کا اعلان ہے، کلمہ جزو عبادت نہیں، بلکہ یہ صرف پڑھنے والے کی ایقانی کیفیت اور جماعتی تعلق کی شہادت ہے۔ جب کوئی آدمی لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے تو وہ اس بات کا اشتہار دے رہا ہے کہ میں آج سے خدا کے سوا کسی اور کو معبود سمجھوں گا نہ اس کی عبادت کروں گا، یہاں تک کہ محمد کی بھی نہیں کیونکہ وہ بھی صرف اس کے رسول ہیں، معبود نہیں۔[۱۲]

مضمون ''الاسلام'' میں مالک رام نے اسلام کے بنیادی اصول اور اس کی تعریف کو سورۂ فاتحہ اور قرآن کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

یہ حقیقت ہے کہ ان سات آیتوں میں وہ سب کچھ آگیا ہے جو دین ہے۔ دیکھا جائے تو قرآن کی بقیہ ۱۱۳ سورتوں میں انہیں آیتوں کی تفسیر و تعبیر ہے۔ منعم اور مغضوب لوگوں کے حالات بیان ہوئے ہیں اور یہ کہ وہ کیوں انعام کے مستحق یا غضب کے سزاوار ٹھہرے۔ اسی لیے سورہ فاتحہ کو ''ام الکتاب'' کے علاوہ ''سبع مثانی'' بھی کہا گیا ہے۔[۱۳]

''اسلامی خلافت'' کے عنوان سے مقالہ میں فاضل مصنف نے لفظ خلافت کے مادہ، معنی اور اصطلاحی تعریف پیش کرتے ہوئے خلفائے راشدین اور خلافت کے لیے صحابہ کرام کے اصول اور طریق کار پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ شوریٰ کی اہمیت کیا ہے اور خلیفہ کے لیے مطلوبہ اسلامی صفات اور اسلامی خلافت کے اصول کیا ہیں۔ ان سب کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

''خلق عظیم'' اور ''افصح العرب'' یہ دونوں مقالے ماہنامہ رسالہ ''فاران'' کراچی میں شائع ہو چکے تھے، لیکن وہاں نام مالک رام نہیں بلکہ ناتھ راو لکھا گیا تھا۔ عنوان بھی الگ یعنی ''رحمۃ اللعالمین ؐ کا سلوک دشمنوں کے ساتھ اور ''فصاحت و بلاغت کی معراج'' تھا۔ پہلے مقالے میں آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کو پیش کیا گیا ہے اور حضرت محمد ﷺ سے مشرکین، یہود اور منافقین کی مخالفت کے اسباب اور مدلل اور جامع بحث کی گئی ہے۔ ''افصح العرب'' میں حضرت محمد ﷺ کی زبان دانی، اسلوب بیان،

---

[۱۲] ماخذ سابق، ص ۲۱۔

[۱۳] ماخذ سابق، ص ۳۲۔

قوت ابلاغ، الفاظ کا انتخاب اور اس کی تراکیب، تبلیغی خطوں، مشہور خطبوں اور روزمرہ کی باتوں کا جائزہ پیش کر کے آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

غرض آپ ﷺ کا تمام کلام فصاحت وبلاغت کا درخشاں نمونہ ہے اور آپ کی حیرت انگیز کامیابی میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔[۱۴]

چھٹا اور آخری مقالہ ''عورت مذاہب عالم میں'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مقالہ مالک رام کی پہلی کتاب ''عورت اور اسلامی تعلیم'' کا گویا خلاصہ بلکہ اس کی توسیع بھی ہے۔ کیونکہ یہاں مذہب اسلام کے ساتھ ساتھ ہندو، عیسائی اور یہودی مذہب میں عورتوں کے مقام ومرتبہ کا تعین بھی ہے، مالک رام نے ہندو، عیسائی، یہودی اور اسلام میں عورت کے درجہ بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد ان تمام مذاہب میں نکاح، طلاق اور مہر وغیرہ پر بحث میں تقابل اور موازنہ کی شان بھی آگئی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ اسلام کے فیضان ہی سے دنیا کے بیشتر مذاہب میں عورتوں کے مرتبے اور ان کی سماجی حیثیت میں مثبت تبدیلیاں آئی ہیں۔ لکھتے ہیں:

اگرچہ ان مذاہب کے پیرو ''قال'' سے تو اسلامی اصولوں کے تفوق کا اقرار نہیں کرتے لیکن وہ اپنے ''حال'' سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ واقعی ان مسائل کا حل ان کے مذہب کی کتاب میں نہیں یا جو اس میں موجود ہے وہ مقتضائے زمانہ سے کم ہے اور اصلی حل وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔[۱۵]

مذکورہ دونوں کتابوں کے مطالعہ وموازنہ کے بعد مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں عالمانہ اور تحقیقی انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے بعض بیانات سے اختلاف اور بعض عربی آیات کے ترجمے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ تاریخی واقعات کے بیان میں بھی چند خامیاں ہیں مگر اس کے باوجود یہ مستند اور معتبر کتابیں ہیں۔ مالک رام نے اسلامیات کے پیش لفظ میں خود اس کی وضاحت کر دی ہے۔ لکھتے ہیں:

مجھے خوب معلوم ہے کہ کہیں کہیں میں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ دوسرے علمائے کرام کے نتائج سے مختلف بھی ہیں۔ غالباً اس کے لیے مجھے کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔ اگر سب لوگ ہر ایک مقدمے میں متفق الرای ہوتے تو نہ قضات کے محکمے کی ضرورت پڑتی، نہ اصحاب

---

[۱۴] ماخذ سابق، ص ۱۳۰۔

[۱۵] ماخذ سابق، ص ۱۸۴۔

فقہ کی۔ دیکھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ فیصلہ کرنے والا کہیں کسی غرض یا نفسانیت کے باعث دیانت اور عدالت کا دامن تو ہاتھ سے نہیں چھوڑ رہا ہے۔ میں پورے اطمینان اور شرح صدر سے ان دونوں سے بری ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔[۱۶]

[۱۶] ماخذ سابق، ص ۱۰۔

مالا بار میں اسلام کی آمد

ایک تنقیدی جائزہ

شکیل الرحمن

ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی۔۲۵

shakeelmau7@gmail.com

ہندوستان میں اسلام کی آمد کا تذکرہ ہوتا ہے تو کیرالا کا نام خود بخود تصور میں گردش کرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ یہ بات عام ہے کہ ہندوستان میں اسلام نے اپنا قدم سب سے پہلے اسی ساحلی علاقہ میں عرب تاجروں کے ذریعہ رکھا تھا، عرب تاجر زمانہ قدیم سے یہاں آتے جاتے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی کی ابتداء میں اسلام کا ظہور ہوا، اور پورے عرب میں ایک انقلاب آگیا۔ اسلام کے پیغام کو فروغ ملا اور اسلام کی تبلیغ کا عمل بھی ہمہ گیر بن گیا۔ عرب تاجروں نے تجارت کے ساتھ اسلام کے پیغام کو عام کرنے کی ذمہ داری بھی لی۔ یہ عرب تاجر بغرض تجارت یمن، بحرین اور عراق وغیرہ ساحلی علاقوں سے ابلہ، دیبل، بھڑوچ، گجرات، ممبئی اور مالا بار وغیرہ کے ساحلی راستوں سے ہوتے ہوئے چین تک کا سفر کرتے تھے[1]۔ انہیں مسلم تاجروں کے ذریعہ ہندوستان کے علاقہ مالا بار اور اس کے نواح میں اسلام کی اشاعت ہوئی ہے۔ اس بحث میں دلائل کے تجزیہ سے قبل عہد نبوی میں ہندوستان کی شہرت و مقبولیت پر ایک سرسری نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان عہد رسالت میں: عوام و خواص میں یہ دعویٰ مشہور ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے اسلام مالا بار کے علاقے میں صحابی رسول حضرت مالک بن دینارؓ کے ذریعہ پھیلا اور چیرامن مسجد یہاں کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ اس دعویٰ کی صداقت کے لئے کتب حدیث و تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب و ہند تعلقات قدیم زمانہ سے قائم تھے۔ بعثت نبوی کے وقت دونوں ایک دوسرے سے نہ صرف بخوبی واقف تھے، بلکہ ہندوستان کی مختلف قومیں عرب کے ساحلی علاقوں میں آباد تھیں۔

---

[1] ندوی، سید سلیمان، عرب و ہند کے تعلقات، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء، صفحہ ۵۔۶

جنہیں اہل عرب زط، اساورہ، سیابجہ، احامرہ، مید، بیاسرہ اور تکاکرہ وغیرہ ناموں سے پکارتے تھے۔تاریخ میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ ان آبادیوں کے وجود کی بنیادی وجہ آپسی تجارت کے ساتھ ایرانی فوج میں بکثرت شامل ہونا ہے۔[۲]

عہد جاہلی اور بعد میں عہد نبوی میں بذریعہ تجارت عرب کے لئے کون کون سی چیزیں ہندوستان سے بھیجی جاتی تھیں، ہند نژاد آبادیاں عرب کے کن کن علاقوں میں تھیں، کس جنگ میں کتنے ہندوستانی قیدی بنائے گئے اور نبی کریم ﷺ نے کن کن بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط لکھے۔احادیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ نبی ﷺ نے ہندوستانی چیزوں کی تعریف کے ساتھ غزوہ ہند کی فضیلت کو بھی بیان کیا ہے۔ نیز طبقات ابن سعد، سیرت ابن ہشام اور تاریخ طبری وغیرہ کے مطابق ۱۰ھ (۶۳۲ء) میں جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نجران سے بنو حارث بن کعب کا وفد لے کر دربارِ نبوی میں حاضر ہوئے تو نبی ﷺ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا مَنْ هَؤُلَاءِ الَّذِينَ كَأَنَّهُمْ رِجَالُ الْهِنْدِ[۳]؟ یعنی یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں۔

یہ روایتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اہل عرب بالخصوص نبی کریم ﷺ اہل ہند کی تہذیب و ثقافت سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن ان تمام معلومات کے باوجود کسی بھی مستند ذریعہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ نبی ﷺ نے کسی ہندی حکمراں کے پاس دعوتی خط یا وفد بھیجا ہو، یا کسی صحابی نے عہد نبوی میں تبلیغ اسلام یا جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ہندوستان کا رخ کیا ہو۔

مالا بار میں اسلام کی آمد سے متعلق روایات: عہد نبوی میں ہندوستان بالخصوص مالا بار میں اسلام کی آمد کے متعلق کچھ روایتیں ایسی ہیں جن میں اس بات کا ذکر ہے کہ یہاں کے لوگوں نے نبی ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے* یا یہ کہ نبی ﷺ نے ہندوستان کے کچھ حکمرانوں کو دعوتی خطوط بھیجے ہیں۔

---

[۲] مبارکپوری، قاضی اطہر۔ عرب و ہند عہد رسالت میں، صفحہ ۱۴

[۳] ابن سعد، محمد، الطبقات الکبری، تحقیق: احسان عباس، ناشر دار صادر، بیروت، ۱۹۶۸ء، ۲۵۶/۱

*اس ضمن میں بابا رتن ہندی کا نام بہت اہم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے احادیث بھی سنی ہیں۔ ان کا مجموعہ حدیث ”رتنیات“ کے نام سے معروف ہے۔ ان کا مزار بھٹنڈہ میں ہے۔ علامہ ذہبی نے ”میزان الاعتدال“ کے ترجمہ نمبر ۲۷۵۹ میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: رتن ہندی بلاشبہ ایک دجال شخص ہے۔ جس نے ۶۰۰ سال بعد صحبتِ نبوی ﷺ کا دعوی کیا۔ حالانکہ صحابہ کرام جھوٹ نہیں بولتے..........الخ

جیسے قنوج کے راجہ سر باتک کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ۶ یا ۷ ہجری میں نبی ﷺ نے حذیفہ، اسامہ اور صہیب رضی اللہ عنہم کے ذریعہ دعوتی خط بھیجا تھا۔ جسے پڑھ کر اس نے اسلام قبول کیا اور نبی ﷺ کو زنجبیل کا تحفہ بھیجا تھا[۴]۔ اور اسی معنی کی ایک روایت امام حاکم نے اپنی مستدرک میں ابو سعید خدری کے حوالہ سے بیان کی ہے کہ ''ہندوستان کے کسی بادشاہ نے رسول اللہ ﷺ کے پاس زنجبیل (سونٹھ) سے بھرا ہوا ایک گھڑا تحفہ میں بھیجا۔ جس سے نبی نے صحابہ کرام کو تھوڑا تھوڑا کھلایا اور مجھے بھی تھوڑا سا دیا''[۵]۔ ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ نبی ﷺ نے سندھ میں اشاعت اسلام کے لئے پانچ صحابہ کرام کو اپنا خط دے کر بھیجا تھا۔ جب یہ لوگ سندھ کے قلعہ نیرون کوٹ (حیدر آباد، سندھ) پہونچے تو وہاں کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے۔ پھر ان میں سے جب دو واپس چلے گئے تو اہل سندھ نے کھل کر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد تینوں صحابہ نے انہیں اسلامی احکام سکھائے۔ ان تینوں کی قبریں آج بھی سندھ میں موجود ہیں[۶]۔ انہیں روایتوں میں ایک مشہور روایت مالا بار کے راجہ سامری (زمورن) یا چکروتی فرماس کا نبی کریم ﷺ کے معجزہ شق القمر کو دیکھ کر خدمت نبوی میں حاضر ہونے اور اسلام قبول کرنے کی ہے[۷]۔ ان روایتوں کے علاوہ ''تحفۃ المجاہدین'' کی تمہید کے مطابق ایک معاصر ہندوستانی محقق بالا کرشنا پلائی کا دعویٰ ہے کہ ''نبی ﷺ نے افریقہ کے بادشاہوں اور مالا بار کے بادشاہ کے پاس دعوتی خطوط بھیجے ہیں۔ رسولِ عربی کا پہلا خط ۶۲۸ء میں مالا بار کے بادشاہ کو ملا۔ اس وقت آپ کی عمر ۵۷ سال تھی۔ اور یہ وہی دور ہے جب مالک بن دینار اور ان کی جماعت مالا بار پہونچی تھی۔ پھر ان کے بعد دس لوگوں پر مشتمل ایک دوسری جماعت ۷۰۱ء میں کدنگلور پہونچی، جس میں اسود اور مرجان نامی دو

---

[۴] عسقلانی، ابن حجر، الإصابة في تمييز الصحابة تحقیق: عادل احمد عبد الموجود و علی محمد معوض، ناشر: دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۱۵ھ، ج ۳، ص ۲۲۹، پٹنی، محمد طاہر، ''تذکرۃ الموضوعات''، ادارہ الطباعۃ المنیریۃ، ۱۳۴۳ھ، ص: ۱۰۲

[۵] الحاکم، محمد بن عبد اللہ نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین، تحقیق: مصطفی عبد القادر عطا، ناشر: دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۰ء، ۴/۱۵۰/۷۱۹۰

[۶] مبارکپوری، قاضی اطہر، خلافت راشدہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، جنوری ۱۹۷۲ء۔ صفحہ ۴۳-۴۴

[۷] فہمی، شوکت علی، ہندوستان پر اسلامی حکومت: دین دنیا پبلیشنگ کمپنی، جامع مسجد، دہلی، مارچ ۱۹۵۱ء، طبع دوم، ص: ۶۹۔ حمید اللہ، محمد، محمد رسول اللہ ﷺ، مترجم: پروفیسر خالد پرویز، ناشر: بیکن بکس، ملتان، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۹۹

شخص تھے"[8]۔

مذکورہ بالا روایات کا تجزیہ: ہندوستان میں اسلام کی آمد سے متعلق مذکورہ بالا روایتوں کو جب اصول جرح وتعدیل پر پرکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی تمام روایتوں کو محدثین و محققین نے باطل قرار دیا ہے۔ قنوج کے راجہ سرباتک کے اسلام لانے اور نبی ﷺ کی زیارت کرنے کے متعلق حافظ ابن حجر نے "الاصابۃ" میں اس کے نبی کریم ﷺ سے لقاء کا دعوی اور عمر دونوں کو لکھنے کے بعد "تجرید اسماء الصحابۃ" کے حوالے سے علامہ ذہبی کا قول نقل کیا ہے کہ یہ صریح جھوٹ ہے[9]۔ اسی طرح علامہ طاہر پٹنی نے راجہ سرباتک کو "تذکرۃ الموضوعات" میں معمر کذابین میں شمار کیا ہے[10]۔ اس کی مزید تفصیل کے لئے دیکھیں قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب "خلافت راشدہ اور ہندوستان"، صفحہ ۴۴ تا ۴۶۔

حدیث زنجبیل جس کو امام حاکم نے عمرو بن حکام ثنا شعبۃ اخبرنی علی بن زید قال سمعت ابا المتوکل یحدث عن ابی سعید الخدری.....الحدیث کے طریق سے بیان کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ "میں نے اس کتاب میں شروع سے اب تک علی بن زید سے ایک حرف بھی روایت نہیں کیا ہے۔ اور اس حدیث کے سواء کسی اور حدیث سے نبی کریم ﷺ کے زنجبیل کھانے کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اسی لئے میں نے اسے روایت کیا ہے"[11]۔ اس پر علامہ ذہبی نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہی وہ راوی ہے جس کو ایک جماعت نے ضعیف قرار دیا ہے اور امام احمد ابن حنبل نے تو اس کی روایتوں کو ترک کر دیا ہے[12]۔ یہی روایت بالکل اسی سند سے امام طبرانی نے "معجم الاوسط" (۳/۴۳/۲۴۱۶) میں ابن الاعرابی نے "معجم" (۱/۱۷۵/۳۰۰) میں اور ابونعیم اصفہانی نے "الطب النبوی" (۱/۲۶۷/۱۶۱) میں روایت کیا ہے لیکن ان سب میں "ملک الھند" کی جگہ "ملک الروم" کا ذکر ہے۔ اس روایت کو امام احمد بن حنبل نے "مسند" (۱۲۲۲۴) میں اور ابن ابی شیبہ نے "المصنف" (۶/۵۱۵/۱۲۶۵) میں یزید بن ہارون

---

[8] المعبری، احمد زین الدین، تحفۃ المجاہدین فی احوال البرتغالیین، تقدیم: محمد سعید الطریحی، مؤسسۃ الوفاء، بیروت، لبنان، ۱۹۸۵ء، ص ۸۰

[9] الاصابۃ، ۳/۲۹۹، ترجمہ: ۳۷۵۵

[10] تذکرۃ الموضوعات: ۱/۱۰۲

[11] المستدرک للحاکم ۴/۱۵۰/۱۹۰۷

[12] ماخذ سابق

اخبرنا سفیان بن حسین عن علی بن زید عن انس بن مالك کے طریق سے روایت کیا ہے اور اس میں دومۃ الجندل کے بادشاہ الاکیدر کا ذکر ہے۔ نیز اس کا ایک راوی علی بن زید مختلط الحدیث و ضعیف راوی ہے۔

اس روایت کے متعلق امام ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ:

میں نے حدیث زنجبیل کے متعلق اپنے والد اور امام ابوذرعہ سے پوچھا تو ان دونوں نے جواب دیا کہ یہ روایت شعبہ کے طریق سے ہمیں نہیں معلوم، البتہ یہ روایت زید بن هارون اخبرنا سفیان بن حسین عن علی بن زید عن انس بن مالك کی سند سے مروی ہے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں میں نے اس پر ان دونوں سے پوچھا کہ کیا اس سند سے یہ روایت صحیح ہے؟ تب انہوں نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ یہ سند زیادہ مناسب ہے۔ اور جہاں تک عمرو بن حکام کی روایت کا معاملہ ہے تو وہ حدیث منکر ہے۔ کیونکہ ہمارے علم کے مطابق اس حدیث کو اس کے سوا کسی نے بھی روایت نہیں کیا ہے۔ اور عمرو بن حکام "لیس بالقوی و لین" راوی ہے[۱۳]۔

اس کے علاوہ اپنی دوسری کتاب "الجرح والتعدیل" میں لکھتے ہیں:

میں نے جب اپنے والد سے عمرو بن حکام کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ خراسان سے آیا تھا۔ اس نے شعبہ سے بہت سی روایتیں بیان کی ہیں، لیکن اس کی اس زنجبیل والی روایت کو منکر قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ تحفہ نجاشی بادشاہ نے بھیجا تھا۔ اور کوئی بعید نہیں کہ اس حدیث کی کوئی نہ کوئی اصل ہو۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ اس پر میں نے پوچھا کہ عمرو بن حکام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تب انہوں نے کہا کہ یہ تو "لیس بالقوی و لین" راوی ہے۔ اس کی احادیث کو لکھا جا سکتا ہے.... اور عبداللہ بن احمد ابن حنبل کہتے ہیں کہ جب میں نے عمرو بن حکام کے بارے میں اپنے والد سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اس نے شعبہ سے تقریباً چار ہزار احادیث روایت کی ہے اور وہ سب کی سب چھوڑ دی گئی ہیں[۱۴]۔

ان کے علاوہ اس روایت کو امام عقیلی نے "الضعفاء الکبیر" (۱۲۷۳/۲۶۵/۳) میں نقل کرنے کے بعد علی ابن المدینی کا قول نقل کیا ہے کہ ""عمرین یعنی عمرو بن حکام اور عمرو بن مرزوق کی احادیث کو چھوڑ

---

[۱۳] ابن ابی حاتم، علل الحدیث، تحقیق: ڈاکٹر سعد بن عبداللہ الحمید، مطابع الحمیضی، ۲۰۰۶ء، ۸/۳۔۹۰۶/۳۲۶

[۱۴] ابن ابی حاتم، الجرح والتعدیل، مجلس دائرۃ المعارف العثمانیۃ بحیدر آباد الدکن، و دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۵۲ء، ۱۲۶۵/۲۲۸/۶

دو۔" اور ابن عدی نے "الکامل فی ضعفاء الرجال" (۱۲۹۸/۲۳۸/۶) میں نقل کیا ہے اور روایتوں میں اختلاط کا سبب علی بن زید کو بتایا ہے۔

اسی طرح اشاعت اسلام کی غرض سے پانچ صحابہ کرام کے سندھ آنے کی جو بات ہے اس کے متعلق قاضی اطہر مبارک پوری اپنی کتاب "عرب و ہند عہدِ رسالت میں" میں لکھتے ہیں:

جس قلمی مجموعہ یادداشت سے یہ روایت نقل کی گئی ہے نہ وہ معتبر ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ جمع الجوامع کون سی کتاب ہے۔ علامہ سیوطی کی جمع الجوامع میں اس طرح کی روایت مستبعد معلوم ہوتی ہے۔

آگے مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

الغرض ۶ ھ یا ۷ ھ میں یا اس سے پہلے ہندوستان میں کسی صحابی کے دعوت اسلام لے کر ہندوستان آنے کی کوئی صحیح روایت نہیں ہے۔ البتہ اس کے آٹھ نو سال بعد خلافت فاروقی کے ابتدائی دور میں عرب سے مسلمانوں کے ہندوستان آنے کی مستند روایت موجود ہے[15]۔

اسی روایت کے متعلق وہ اپنی دوسری کتاب "خلافت راشدہ اور ہندوستان" میں لکھتے ہیں:

مجموع الرسائل نام کی قلمی کتاب میں جمع الجوامع کے حوالہ سے یہ روایت درج ہے۔ لیکن کسی دوسری کتاب میں اس جیسی کوئی روایت نہیں ملی۔ اور نہ کسی دوسرے ذریعہ سے اس کی تصدیق وتائید ہوتی ہے۔ اور بظاہر یہ روایت بھی بے اصل معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس روایت کے الفاظ عربیت کے قواعد کے اعتبار سے نہایت رکیک ہیں[16]۔

معجزہ شق القمر کے متعلق شوکت علی فہمی لکھتے ہیں:

مالا بار کے راجہ زمورن سامری پالو یا خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس راجہ نے معجزہ شق القمر دیکھنے کے بعد اس عجیب و غریب واقعہ کو اپنی ریاست کے سرکاری روزنامچہ میں درج کرادیا تھا۔ .....(اس کے بعد) راجہ نے اس عجیب و غریب واقعہ کی تحقیق و تفتیش کرائی۔ جب راجہ کو معلوم ہوا کہ یہ عرب کے نئے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کا معجزہ تھا تو فوراً مسلمان ہو گیا اور اپنی ریاست ولی عہد کے سپرد کرنے کے بعد بادبانی جہاز کے ذریعہ رسول اللہ کی زیارت کے لئے

---

[15] مبارک پوری، قاضی اطہر، عرب و ہند عہد رسالت میں، صفحہ ۱۹۱

[16] مبارک پوری، قاضی اطہر، خلافت راشدہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۷۲ء، صفحہ: ۴۳۔۴۴

عرب کے لئے روانہ ہو گیا۔ لیکن بد قسمتی سے راستہ ہی میں فوت ہو گیا اور اس کی لاش یمن لا کر دفن کی گئی[۱۷]۔

یہی واقعہ تاریخ فرشتہ میں بھی ہے لیکن اس میں بادشاہ کے نام کی وضاحت نہیں ہے۔ نیز اس بات کا اضافہ بھی ہے کہ واقعہ کی تحقیق کے بعد سامری مدینہ گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، خانہ کعبہ کی زیارت کی اور پھر واپس خدمت نبوی میں حاضر ہو کر وطن واپسی کی اجازت لی اور ایک جماعت کے ساتھ وطن روانہ ہوا راستہ میں مقام ظفار میں بیمار ہوا اور انتقال کر گیا۔ اب بھی اس کی قبر وہاں موجود ہے اور لوگ اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں[۱۸]۔

اس طرح دونوں روایتوں میں تضاد پیدا ہوتا ہے اور اس کے رفع کی کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس واقعہ کو ڈاکٹر حمید اللہ نے ''سبحۃ المرجان'' کے حوالے سے اپنی کتاب ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے صفحہ ۱۱۹، پیراگراف ۲۴۰ میں نقل کیا ہے، جس میں انہوں نے بادشاہ کا نام چکرورتی فرماس بتایا ہے اور اس کی صداقت پر خاموشی اختیار کی ہے۔ اس لئے عہد نبوی میں ان کے ہاتھ پر سامری کے اسلام کا دعوی درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔

اب رہی بات بالا کرشنا پلائی کے دعویٰ کی تو اس کی حقیقت ایک افسانہ اور مفروضہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں لگتی۔ کیوں کہ یہ محقق کون ہے اور کہاں پر اس نے یہ دعوی کیا ہے ماخذ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تلاش بسیار کے بعد بھی بالا کرشنا پلائی نام کے کسی محقق یا مؤرخ تک میری رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ نیز اس دعوی میں ایک تو مالا بار کے بادشاہ کا نام مجہول ہے۔ دوسرے مالک بن دینار نامی کسی صحابی کے ہونے اور پھر ان کے ہندوستان آنے کا تذکرہ تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب، میزان الاعتدال، تجرید الصحابۃ، الاصابۃ اور الانساب وغیرہ اسماء الرجال کی کسی کتاب میں مجھے نہیں ملا۔ البتہ علامہ مزی نے اپنی کتاب تهذيب الكمال في اسماء الرجال میں مالک بن دینار نامی ایک بصری تابعی کا ذکر کیا ہے لیکن اس میں ان کے ہندوستان آنے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے[۱۹]۔ اسی طرح مالا بار کے بادشاہ کے

---

[۱۷] شوکت علی فہمی، ص: ۶۹

[۱۸] فرشتہ، محمد قاسم، تاریخ فرشتہ (اردو)، لکھنؤ، مطبع منشی نول کشور، جلد دوم، ص: ۴۹۱۔

[۱۹] المزی۔ تهذيب الكمال في اسماء الرجال، تحقیق: بشار عواد، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء، جلد: ۲۷، ص: ۱۳۵، ترجمہ نمبر: ۵۷۳۷

نام نبی کریم ﷺ کے کسی خط کا سراغ بھی نہیں لگ سکا۔ خطوط نبوی کے محقق ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں ''سرور کائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ ہندوستانیوں سے ضرور واقف تھے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ہادیٔ کون و مکاں ﷺ ہندوستانیوں کے مذہب سے بھی واقفیت رکھتے تھے''[20]۔ نیز ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں، ''کیا نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفی ﷺ کے ہندوستان سے رابطے اور تعلقات تھے؟ اس حوالے سے کامل یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم یہ ناممکن بھی نہیں''[21]۔
اگر نبی کریم ﷺ کا کوئی خط ہندوستان آیا ہوتا تو ڈاکٹر حمید اللہ اس کو بطور دلیل کے پیش کرتے اور سوال کر کے عدم یقین کی بات نہ کرتے۔

لٰہذا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں مالا بار میں اسلام کی آمد کی جو بات کہی جاتی ہے اس کا بنیادی ماخذ کیا ہے؟ اس کے جواب میں شیخ احمد زین الدین مالا باری (متوفی ۱۵۸۳ء) کی کتاب ''تحفۃ المجاھدین فی احوال البرتغالیین''، محمد قاسم فرشتہ (متوفی ۱۶۲۰ء) کی کتاب ''تاریخ فرشتہ''، ولیم لوگن (متوفی ۱۹۱۴ء) کا گزیٹر ''مالا بار مینول'' اور کے. پی. پدمانبھا مینن کی کتاب ''ہسٹری آف کیرالہ'' کا نام ملتا ہے۔ ان تمام کے یہاں مالا بار میں اسلام کی آمد کی جو دلیل دی گئی ہے وہ تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ ایک ہی ہے۔ جس میں مرکزی کردار مالا بار کے راجہ سامری (زمورن) کا عرب مسلمانوں کی ایک جماعت، جو قدم آدم کی زیارت کے لئے سیلان (سری لنکا) جا رہی تھی، کے ایک بزرگ اور سردار کے ہاتھ پر اسلام لانے کے بعد نبی ﷺ سے ملاقات کے لئے مکہ کا سفر کرنا ہے۔
ان تمام مآخذ میں سب سے قدیم تحفۃ المجاھدین ہے۔ اس لئے ایسا لگتا ہے کہ بعد کے تمام لوگوں نے ان کے نقش قدم کی پیروی میں اس واقعہ کو بلا تحقیق و حوالہ کے نقل کر لیا ہے۔ بلکہ محمد قاسم فرشتہ نے تو اس بات کا اقرار کیا ہے کہ مالا بار کے بادشاہوں کے تذکرہ سے متعلق میری نظر سے ایک بھی تاریخی کتاب کا گزر نہیں ہوا ہے، اس لئے یہاں (مالا بار) کے واقعات کا تذکرہ تحفۃ المجاہدین کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے[22]۔ اس واقعہ کو صاحب تحفہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

---

[20] حمید اللہ، محمد، محمد رسول اللہ ﷺ، مترجم: پروفیسر خالد پرویز، بیکن بکس، ملتان، لاہور۔ ۲۰۱۳ء۔ ص: ۴۴
[21] ڈاکٹر حمید اللہ، ص: ۱۹۷
[22] تاریخ فرشتہ، جلد: دوم، ص: ۴۸۸

مالا بار کے علاقہ کدنگلور میں سب سے پہلے یہود و نصاریٰ کا ورود و قیام ہوتا ہے۔ ان کے بعد مسلم فقراء کی ایک جماعت، جن میں ایک بزرگ شخص بھی تھے، قدم آدم کی زیارت کے لئے سیلان (سری لنکا) جارہی تھی۔ جب یہ جماعت مالا بار پہونچی اور وہاں کے بادشاہ کو ان کا علم ہوا تو اس نے انہیں اپنے دربار میں طلب کر کے ان کی خاطر تواضع کی۔ اور پھر ان کے متعلق دریافت کیا تو بزرگ شخص نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات، معجزہ شق القمر اور دین اسلام کے بارے بتایا۔ جسے سن کر بادشاہ کے دل میں ایمان جاگزیں ہوگیا اور بادشاہ نے کہا کہ جب آپ لوگ زیارت سے واپس ہوں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیں۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنی مملکت کے مختلف حصوں کا الگ الگ حکمراں بنا کر ان کے ساتھ (زیارت نبوی) کے لئے نکل پڑا۔ راستہ میں مقام شحر پہونچ کر جب بادشاہ سخت بیمار پڑ گیا تو اس نے مالا باری زبان میں ایک وصیت نامہ لکھ کر اپنے رفقاء کو دیا کہ جب میرے علاقہ میں پہونچیں تو اسے میرے وطن کے حکمراں کو دے دینا۔ اس کے بعد وہیں پر اس بادشاہ کا انتقال ہوگیا اور لوگوں نے اسے وہیں دفن کر دیا۔ پھر اس کا وصیت نامہ لے کر اس کے علاقہ مالا بار پہونچے۔ اس جماعت میں مالک بن دینار، ان کے ماں شریک بھائی شرف بن مالک اور بھتیجے حبیب بن مالک کا نام قابل ذکر ہے۔ انہوں نے مالا بار میں تبلیغ اسلام کے ساتھ مختلف مقامات پر مساجد کی تعمیر بھی کی ہے۔ انہیں میں سے ایک کدنگلور علاقہ کی ''چیرامن جامع مسجد'' ہے۔ جس کے تعلق سے یہ مشہور ہے کہ یہ ہندوستان کی سب سے پہلی اور قدیم مسجد ہے۔ اس کو ۶۲۹ء میں مالک بن دینار نے بنوایا تھا[۲۳]۔

اس واقعہ کے پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ یہ عہد نبوی کا واقعہ ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ عہد نبوی سے بہت بعد کا ہے۔ کیونکہ صاحب تحفۃ نے اس واقعہ کو اگرچہ بلادلیل نقل کیا ہے، لیکن اس کے اختتام پر اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مالا بار میں اسلام کے آمد کی یہ پہلی دلیل ہے۔ جس کی تاریخ کا ہمیں کوئی علم نہیں، غالب گمان یہی ہے کہ یہ واقعہ دو سو ہجری (آٹھ سو عیسوی) کے بعد کا ہے''[۲۴]۔ اور فرشتہ نے لکھا ہے کہ ''ظہور اسلام سے قبل و بعد یہود و نصاریٰ بغرض تجارت دریا کے راستہ سے اس علاقہ میں آمد و رفت کرتے تھے اور کچھ لوگوں نے یہاں پر اپنی کوٹھیاں بھی بنا رکھی تھیں.... یہ طریقہ عہد نبوی تک جاری رہا۔ اس کے بعد ہجری سال ۲۰۰ سے متجاوز ہوگیا

---

[۲۳] تحفۃ المجاہدین ص ۲۲۳۔۲۲۸

[۲۴] ماخذ سابق ص ۲۲۹

تب مسلمانوں کی ایک جماعت یہاں پہونچی"[۲۵]۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں اگر اس کا سال وقوع ۲۰۰ ہجری ہی مان لیا جائے تب بھی یہ واقعہ باطل قرار پاتا ہے۔ کیوں کہ نبی ﷺ کی وفات کے ۱۹۰ سال بعد نبی ﷺ سے ملاقات اور ان کے اصحاب سے فیض یاب ہونے کی بات سوئی کے ناکے سے اونٹ گزارنے جیسی ہے۔ اس واقعہ میں مزید کرم فرمائی یہ کی گئی ہے کہ اس کے اہم کردار مالک بن دینار اور ان کے اصحاب کو صحابی کا درجہ دے کر ان کے ہاتھوں ۶۲۹ء میں چیرامن جامع مسجد کی تعمیر بھی کر دی گئی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ میں مالک بن دینار اور ان کے بھائی اور بھتیجے کو صحابہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، کتب تراجم وطبقات میں ان میں سے کسی کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ یہ سبھی لوگ مجہول الحال ہیں۔ ہاں مالک بن دینار کا نام ملتا ہے، لیکن اس میں دقت یہ ہے کہ یہ واقعہ نویں صدی عیسوی کا ہے اور کتب تراجم میں مذکور مالک بن دینار آٹھویں صدی عیسوی کے ہیں۔ اسی طرح اس پورے واقعہ میں انہیں صحابی بتایا گیا اور کتب تراجم میں ہے کہ وہ بصرہ کے رہنے والے مشہور عابد وزاہد تابعی تھے۔ ان کی وفات ۷۴۸ء میں بصرہ میں ہوئی اور ان کی قبر بھی بصرہ ہی میں ہے۔ کسی بھی طرح سے ان کا ہندوستان آنا ثابت نہیں ہے[۲۶]۔ چنانچہ اس پورے واقعہ کی اسنادی حیثیت سراب سے کم نہیں۔ اس لئے اس جماعت کے لوگوں بالخصوص مذکورہ بالا تینوں ناموں کو صحابہ تصور کرنا صحیح نہیں ہے۔

عہد جدید کے مشہور مؤرخ تاراچند نے چیرامن پیرومل بادشاہ کے اسلام لانے کے واقعہ کو نویں صدی عیسوی کا بتایا ہے، جو کہ صاحب تحفہ کے بیان کے موافق ہے۔ انہوں نے پورا واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

> چیرامن پیرومل بادشاہ کے اسلام کا یہ واقعہ ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ جیسا افسانوں میں ہوتا ہے، اس میں بھی بہت سی تفصیلات ایسی ہی ہیں جن کا مشکوک ہونا بالکل واضح ہے۔ نیز اس واقعہ میں مذکور ناموں کو تاریخی اعتبار سے کبھی بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چیرامن پیرومل صرف ایک لقب ہے اور صوفی بزرگ مالک بن دینار کا ہندوستان آنا بھی مشکوک ہے۔ نیز شیخ زکی الدین (Shaikh Sekke Uddin) کا نویں صدی عیسوی کے بادشاہ چیرامن پیرومل کا معاصر

---

[۲۵] تاریخ فرشتہ، جلد: دوم، ص: ۴۸۸

[۲۶] المزی، جلد: ۲۷، ص: ۱۳۵، ترجمہ نمبر: ۵۷۳۷

ہونا بھی ناممکن ہے۔ کیوں کہ مسلمانوں میں ناموں کے ساتھ بطور لاحقہ ''الدین'' کا استعمال پانچویں صدی ہجری یعنی گیارہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا ہے[۲۷]۔

ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں عرب مسلمانوں کی آمد کا پہلا تاریخی اور تحریری ثبوت آٹھویں صدی عیسوی میں ملتا ہے۔ عمومی طور پر ان کا یہ دعویٰ غلط ہے کیوں کہ انہوں نے خود ۶۳۶ء میں تھانہ و بھڑوچ پر عثمان بن ابی العاص کے حملے کی تائید کی ہے۔ لیکن لگتا ہے ان کا یہ دعویٰ مالا بار کے متعلق ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد انہوں نے میت کنو (Mayyatkannu) کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ یہ کولم کے ایک قبرستان کا نام ہے۔ جس میں بہت سی پرانی قبریں ہیں، جن پر نام و تاریخ وفات کندہ ہے۔ ان میں سب سے قدیم قبر علی بن عثمان نامی ایک شخص کی ہے۔ اور اس پر ۱۶۶ھ یعنی ۷۸۳ء کی تاریخ نقش ہے[۲۸]۔ اسی طرح محمد سعید الطریحی کا ماننا ہے کہ مالا بار کی کھدائی میں سب سے قدیم جو اسلامی سکہ پایا گیا ہے اس پر ۷۱ھ (۶۹۱ء) کا سن کندہ ہے[۲۹]۔

ان تمام وضاحتوں کے علاوہ چیرامن راجا سامری کے اسلام سے متعلق روایتوں میں کافی زیادہ تضاد پایا جاتا ہے۔ زین الدین معبری کے مطابق اس نے ایک مسلم بزرگ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا پھر نبی کی زیارت کے لئے نکلا لیکن راستہ میں مقام شحر پر انتقال کر گیا۔ جب کہ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ نبی ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور وطن واپسی میں راستہ میں مقام ظفار پر وفات پائی۔

مذکورہ بالا بحث کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ عہدِ نبوی میں تاجر صحابہ کے ذریعہ ہندوستان کے علاقہ مالا بار میں سب سے پہلے اسلام کے پہونچنے کی جو بات مشہور ہے اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے اور اس سے متعلق جو روایات بیان کی جاتی ہیں وہ اصول حدیث اور جرح و تعدیل کے پیمانہ پر کھری نہیں اترتی ہیں۔ نیز اس دعوی کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے کہ چیرامن مسجد کی تعمیر ۶۲۹ء میں صحابی رسول مالک بن دینار کے ذریعہ ہوئی۔ لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہندوستان میں اسلام سب سے پہلے کب و کہاں آیا اور چیرامن مسجد کا بانی کون ہے؟ اس کا جواب ایک مستقل تحقیق کا طالب ہے۔

---

[۲۷] *Influence of Islam on Indian Culture*, p. 35

[۲۸] *Ibid*, pp.32-33

[۲۹] مقدمہ تحفۃ المجاہدین، صفحہ ۷۹

عصرِ حاضر کے تناظر میں غالبؔ کی فلسفیانہ بصیرت

ڈاکٹر طالب اکرام

الٰہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج، یوپی

talibikram3@gmail.com

اردو شعر وادب میں غالبؔ اپنی منفرد اور یکتا پہچان رکھتے ہیں۔ وہ جدت پسندی کے قائل تھے۔ انھوں نے اُردو شعر وادب کو نئی سمت ور فتار سے روشناس کیا۔ وہ ایک فلسفیانہ ذہن وفکر کے پاسدار تھے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ بصیرت کا نمایاں رنگ غالب ہے چونکہ ان کے عہد میں تصوف کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اہل باطن کے نزدیک تصوف انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ غالبؔ کا ذہن فکر وفلسفہ دونوں اعتبار سے بیدار تھا۔ لہٰذا ان کا تصوف کی طرف راغب ہونا ناگزیر تھا" یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ" اس بات کی غمازی کرتا ہے۔ وہ تصوف وجودی کے مقلد تھے۔ ان کے نزدیک ہر چیز میں خدا جاگزیں ہے حور وملک، زمین وفلک، شمس وقمر، شجر وحجر، بحر وبر اور انس وجن سبھی خدا کی ذات کا مظہر ہیں جیسا کہ ایک جگہ کہتے ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

وہ خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھتے تھے اور اس کی یکتا پرستی کو صوفیانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس کی یگانگی کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ سبھی کے سر تسلیم خم ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک " اسے کون دیکھ سکتا ہے وہ تو یگانہ ہے یکتا ہے"۔

دراصل مرزا غالبؔ کا مطالعہ بڑا عمیق ودقیق اور وسیع تھا۔ اس لیے ان کی نظر میں گہرائی اور گیرائی موجود تھی۔ کلام کرنے میں انھیں مہارت تامہ حاصل تھی۔ وہ ہر بات دل کی گہرائیوں سے کہتے تھے اور "بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" اس لیے ان کی بات میں کشش ہوتی تھی۔ غالب کسی خاص فلسفے یا نظریے کے راہ رو نہیں تھے لیکن زندگی کے مختلف زاویوں اور فلسفوں پر ان کی نظر تھی جن سے وہ قدرے متاثر بھی تھے لیکن حیات وکائنات کے ضمن میں ان کی فکر خود ان کے اپنے مشاہدات وتجربات کی غماز تھی۔ انھوں نے زندگی کو رنگ برنگے پھول کی شکل میں کھلتے، مہکتے اور

مرجھاتے دیکھا،اسے ہر رنگ میں محسوس کیا،اس کا ہر طرح سے جائزہ لیا،پھرایک باشعور اور باصلاحیت شخص کی طرح اس پر غور و فکر کیا اور اپنا نتیجہ اخذ کیا۔ تصوف کے مسائل کے تعلق سے بھی ان کا یہی خیال تھا۔ وہ پہلے تمام تر پہلوؤں پر غور و فکر کرتے تھے پھر ان پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ وہ تصوف کے اسرار و رموز سے واقفیت رکھتے تھے۔انھیں معرفت الٰہی حاصل تھی۔ مولانا فخر الدین دہلوی کے خاندان چشتیہ سے بیعت بھی تھے جس کا ذکر محمد حسین آزادؔ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ''آب حیات''میں بھی کیا ہے۔ لیکن خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے ''یادگار غالبؔ''میں لکھا ہے کہ مرزا غالبؔ بہادر شاہ ظفر کے اتباع میں حضرت شاہ نصیر الدین المعروف کالے شاہ دہلوی کے دست اقدس پر بیعت تھے اور ایک جگہ اپنے استاد مرزا غالبؔ کے فلسفۂ تصوف کے ضمن میں لکھا ہے:

> علم تصوف جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ''برائے شعر گفتن خوب است''اس سے مرزا غالبؔ کو خاص مناسبت تھی، حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرے تھے اور سچ پوچھئے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ بارہویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنا دیا تھا۔[1]

غالبؔ خالص صوفی تو نہیں تھے البتہ صوفی منش شاعر ضرور تھے یہی سبب ہے کہ اُن کی شاعری میں تصوف کے عناصر جابجا نظر آتے ہیں۔ اپنے کلام میں انھوں نے عشقِ حقیقی اور ذاتِ اطہر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ کارخانہ خدا کو ایک صوفیانہ نگاہ سے دیکھتے تھے اور بنی نوع انسان کی خدمت شعاری کو اپنا وظیفہ حیات سمجھتے تھے۔ غمزدوں کی غم خواری،دل جلوں کی دلداری اور بے کسوں کی بندہ پروری کو انسانیت سے تعبیر کرتے تھے۔ خود غرضی،انا پرستی، کم ہمتی اور بے رغبتی کو مضر گمان کرتے تھے اور جمود و سکوت، لاعلمی اور بے عملی کے بر خلاف آواز بلند کرتے تھے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی بات کرتے تھے، جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی کی بانگ دیتے تھے۔ان کی شاعری میں جہاں مشکل پسندی ہے وہیں سادگی کے جوہر بھی خوب نمایاں نظر آتے ہیں۔اُن کے بعض اشعار سہل ممتنع کی اعلیٰ نظیر سادگی تاثیر اور فلسفہ وجودی کی عمدہ مثالوں سے پر ہوتے ہیں۔ وہ ہمہ اوست نظریہ کے پیروکار تھے اور تمام موجودات کی حقیقت کو حقیقتِ ذاتِ باری تسلیم کرتے تھے۔ وہ ہر چیز میں خدا کا جلوہ محسوس کرتے تھے۔ان کے مطابق اگر ذرہ کا دل چیریں تو اس میں سے خورشید کا ہی لہو

---

[1] الطاف حسین حالی، یادگار غالبؔ، نامی پریس کانپور، ۱۸۹۷، ص ۵۹

ٹپکے یعنی خدا کا ہی حسن نظر آئے۔ایک جگہ کہتے ہیں:

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا[۲]

اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو غالبؔ کے بیشتر کلام میں وجودی رنگ نمایاں ہے۔وہ خدا کے صفات کو بقول ممتاز حسین:

اس کے عین تسلیم کرتے ہیں اور عالم اس سے اس طرح پیوستہ ہے جس طرح روشنی آفتاب ہے وہ ہر عالم میں ممکن سے واقع تک اپنے سے اپنے پر جلوہ گر ہے[۳]۔

بعض اوقات غالبؔ کے یہاں وجودی کے ساتھ ساتھ شہودی رنگ بھی نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ کریں جس کا پہلا مصرعہ وجودی ہے اور دوسرا مصرعہ شہودی:

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا[۴]

یہاں پہلا مصرعہ وجودی اور دوسرا شہودی ہے۔وحدت الوجود کو ہمہ اوست اور وحدت الشہود کو ہمہ از اوست بھی کہتے ہیں۔وجودی نظریہ کے بانی محی الدین ابن عربی اور شہودی نظریہ کے موجد شیخ احمد سر ہندی مجدد الف ثانی کو قرار دیا گیا ہے۔ابن عربی کا نظریہ ہے کہ ہر چیز میں خدا جلوہ گر ہے۔ہر شے خدا کا عین ہے،یعنی لوہے کو آگ میں ڈالنے پر لوہا آگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اب اسے لوہا نہیں آگ کہیں گے۔اسی لیے منصور حلاج نے نعرہ دیا انا الحق (میں خدا ہوں)۔لیکن مجدد الف ثانی نے نظریہ پیش کیا کہ ہر چیز میں خدا کا جلوہ ہے۔یعنی سالک فنا کے بعد بقا کی حالت میں رسائی کرتا ہے۔لوہا آگ میں داخل ہونے پر آگ ہوتا ہے لیکن باہر نکلنے پر لوہے کی اپنی حالت برقرار ہوتی ہے۔مجدد الف ثانی کہتے ہیں کہ منصور نے جو نعرہ دیا انا الحق،اس کا مطلب یہ ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں خدا ہی سب کچھ ہے۔دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''من نیستم و موجود حق است''،یعنی میں نہیں ہوں حق ہی حق ہے، حق ہی موجود ہے،میری حقیقت عدم ہے اور حق وجود ہی وجود ہے۔حق حقیقت میں موجود ہے اور بندہ

---

[۲] غلام رسول مہر،دیوان غالبؔ،علمی پرنٹنگ پریس لاہور،۱۹۶۷،ص ۵۱

[۳] ممتاز حسین،غالبؔ ایک مطالعہ،نصرت پبلشرز لکھنؤ،۱۹۸۶،ص ۹۳

[۴] غلام رسول مہر،دیوان غالبؔ،ص ۴۷

حقیقت میں معدوم ہے۔دونوں میں غیریت موجود ہے۔عینیت عقیدہ نہیں،حال ہے،اسی کی وضاحت وصراحت کرتے ہوئے غالبؔ کہتے ہیں:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں[۵]

اسی طرح درج ذیل اشعار میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں کے رنگ نمایاں ہیں۔اشعار ملاحظہ ہوں:

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا؟
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے[۶]

غالبؔ کے کلام میں جہاں روانی، متانت، برجستگی، شائستگی، ندرتِ خیال اور جذبات کی مصوری موجود ہے،وہیں متصوفانہ عکاسی بھی غالب ہے۔اس کے علاوہ ان کی شاعری میں صنائع وبدائع کا چنیدہ انتظام و انصرام بھی نظر آتا ہے جو فلسفیانہ زیور سے آراستہ و پیراستہ ہے۔انھیں خصوصیات کی بنا پر ان کی شاعری بالخصوص نوجوانوں کے لیے چنگاری کا اثر رکھتی ہے۔انھیں خوابیدگی سے بیدار کرتی ہے اور ان کے پیکرِ خاکی میں جان پیدا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں صوفیانہ بصیرت کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ایک جگہ کلمہ طیبہ کی تفسیر و تعبیر صوفیانہ انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں گویا گاگر میں ساگر بھر دیا ہو۔شعر ملاحظہ ہو:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا[۷]

---

[۵] ماخذ سابق، ص ۱۳۹
[۶] ماخذ سابق، ص ۲۴۷
[۷] ماخذ سابق، ص ۵۷

دراصل ارباب تصوف کے نزدیک کلمہ طیبہ کے چھ مدارج ہوتے ہیں۔لا، الہ، الا اللہ، محمد، رسول اور اللہ۔ایک سالک کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے ان مدارج کو طے کرے جس کے لیے مرشد کامل کی صحبت اختیار کرنا لازم ہے۔ان مدارج کو طے کرنے کے بعد سالک فنافی الشیخ، فنافی الرسول اور فنافی اللہ کے منازل طے کرتا ہے پھر معرفت کے اسرار و رموز سے روشناس ہوتا ہے۔جیسا کہ غالبؔ کہتے ہیں:

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر[8]

سالک ذکر الٰہی اور کلمہ طیبہ کے ضرب سے اپنے ظاہر اور باطن کو روشن و منور کرتا ہے۔اپنے نفس کا تزکیہ، قلب کا تصفیہ اور روح کا تجلیہ کرتا ہے اور اپنے اندر صفاتِ حق پیدا کرتا ہے۔اسی رمز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مومن کہتے ہیں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا[9]

یہاں ہم اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے محض ''لا'' پر گفتگو کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ''لا'' کے معنی ''نہیں'' کے ہوتے ہیں۔انسان جب اپنا محاسبہ کرتا ہے یعنی مجاہدہ اور مذاکرہ کے ذریعہ اپنے اندر سے تمام خامیوں اور کمیوں (انا، ہم، تکبر، حسد، بغض، کینہ، مکر، فریب، ریا، جھوٹ، غیبت، حرص، طمع، لالچ، ہوس، شہوت اور نفس پرستی وغیرہ کے عناصر) کو حذف کرلیتا ہے تو اس کا دل روشن و منور ہو جاتا ہے اور قلب میں حق کے جلوؤں کا ظہور ہو جاتا ہے۔غالبؔ کہتے ہیں ''ڈبویا مجھ کو ہونے نے''یعنی میرے قلب میں انا، میں یا ہم وغیرہ کا تصور نہ ہوتا تو خدا کا جلوہ نمایاں ہوتا۔کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔مومن بھی یہی کہتے ہیں کہ جب میرا دل صیقل و منزہ اور صاف و شفاف ہوتا ہے تو قلب میں خدا ہوتا ہے۔معرفت کے اسی بھید کو افشا کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی[10]

---

[8] ماخذ سابق، ص ۹۶

[9] ڈاکٹر انوار الحسن، دیوان مومن، جمال پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۷۱، ص ۳۹

[10] محمد اقبال، بانگ درا، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۱، ص ۱۰۲

غالبؔ ترک دنیا کے قطعی قایل نہ تھے۔ وہ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے اور اسے ''وحشت'' کی اصطلاح سے موسوم کرتے تھے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جانا اور غار میں جا کر اللہ اللہ کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے برعکس وہ دنیا میں لوگوں کے درمیان رہ کر خدا کو یاد رکھنے کے فلسفے پر یقین رکھتے تھے اور اس کی پاسداری بھی کرتے تھے کیوں کہ ''ترک و تجرید'' کی حقیقت بھی یہی ہے لیکن بعض نااہل صوفی ایسے بھی ہوتے ہیں جو فلسفیانہ و صوفیانہ بصیرت سے ناواقف ہوتے ہیں اور اپنی کم علمی کے باعث بنی نوع انسان سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور ''ترک و تجرید'' کے معنٰی کو دنیا و مافیہا سے بے نیاز رکھنا گمان کرتے ہیں لیکن غالبؔ کی بانگ اس کے بر خلاف تھی۔ وہ اسے رہبانیت کے اسم سے موسوم اور وحشت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے تھے جسے کسی دوسرے کا ذمہ دار نہیں سمجھتے تھے بلکہ بذات خود اپنے نفس کو غالبؔ گمان کرتے تھے۔ جیسا کہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں:

وار ستگی بہانہ بے گانگی نہیں

اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو[11]

غالبؔ کی شاعری میں عارفانہ توازن کا واضح سراغ ملتا ہے جسے انھیں شکست کے اندوہناک احساس اور ہمت کی عزم آفرینی کے درمیان موصول ہوا۔ نفی اثبات کی کشمکش کا مستقل فلسفیانہ حل مرزا غالبؔ کو تصوف وجودی میں ملا جس کا اعتراف غالبؔ اپنے خطوط میں کرتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

زبان سے لاالہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔[12]

اسی کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام ایک جگہ لکھتے ہیں:

لاموجود الا اللہ اور لا موثر فی الوجود غیر اللہ لیکن جب لا کے ذکر میں غالبؔ حد سے گزرنے لگتے ہیں تو فوراً الا کی خواہش ابھر آتی ہے اور وہ اپنے آپ کو روک لیتے ہیں[13]۔

غالبؔ سے قبل اُردو شاعری میں محض جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی تھی اور گل و بلبل کی قیاس آرائیاں اور ان کے مشغلہ کا ذکر ہوتا تھا۔ عشق و عاشقی کے بندھن میں قید ہوتے تھے مگر غالبؔ نے اس قید کی زنجیر کو توڑ دیا اور اس میں فکر و فلسفے کو داخل کیا جس سے اردو شعر و ادب کو نئی زندگی ملی۔ جدت

---

[11] غلام رسول مہر، دیوان غالب، ص ۱۶۵

[12] غلام رسول مہر، خطوط غالبؔ، علمی پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۶۲، ص ۸۷-۸۸

[13] شیخ محمد اکرام، حکیم فرزانہ، معارف پریس لاہور، ۱۹۷۷، ص ۱۱۰-۱۱۱

پسندی ہی ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اُن کی پہچان بیان اور اسلوب کی جدت پسندی ہے۔ انہوں نے منفرد لب و لہجہ اختیار کیا اور اپنے مختصر سے دیوان میں معنی و مفاہیم کا خزانہ بھر دیا۔ فارسی کے مشہور شعرا کے طرز پر اردو میں بھی صوفیانہ رنگ داخل کیا جس سے کلام میں تصوف، حکمت، سوز و ساز، دل نشینی، گہرائی و گیرائی، ندرت بیان، دعوت فکر اور فصاحت و بلاغت کے عناصر جا گزیں ہوئے جس کے باعث اردو شعر و ادب میں انہیں منفرد مقام ملا۔ ان کی شخصیت ہمہ گیر تھی وہ جہاں مشاعروں میں مسند زریں پر رونق افروز ہوتے تھے وہیں خانقاہوں میں بھی صوفیوں کے درمیان نظر آتے تھے اور تصوف کے فلسفیانہ اسرار و رموز پر گفتگو کرتے تھے۔ وہ شاہد و مشہود کے راز و نیاز سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ معرفت الٰہی کے حصول کے لیے دل کا درست ہونا اشد ضروری ہے۔ جب بندہ کے اندر سے دنیا کی تمام خامیاں اور کمیاں حذف ہو جاتی ہیں تو وہ ایک کامیاب انسان بن جاتا ہے اور معاشرے میں مثبت اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں جس سے معاشرہ خوش گوار ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اس کے جذبات ماند نہیں پڑتے ہیں بلکہ مزید برانگیختہ ہوتے ہیں۔ جد وجہد کا سفر مسلسل جاری و ساری رہتا ہے۔ وہ ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی اور نئے آندھی نیا طوفان کے لیے راہ ہموار کرتا ہے کیوں کہ حیات نام ہی ہے انسانی ہستی کے اس سفر کا جو ہمہ وقت جاری و ساری رہتا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں[14]

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حباب موجہ رفتار ہے نقشِ قدم میرا[15]

یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہے کہ رسول اللہ کی ساری زندگی جد وجہد اور سعی پیہم میں گزری۔ وہ کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے بلکہ عمل پیہم سے خودی کو بیدار کرنے کی تلقین کی۔ وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ عرق انفعال کے قطرہ کو باری تعالیٰ کبھی رائیگاں نہیں کرتا، اسے قیمتی موتی بنا کر کامیابی کی جانب گامزن کر دیتا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں ایک انسان کے اس کی ہمت کے مطابق تقدیر بنتی ہے۔ اس میں جتنی ہمت، ظرف اور وسعت ہوتی ہے اسی کے مطابق تقدیر بنتی ہے۔ لہٰذا ہمت کا بلند ہونا ازبس ضروری ہے۔ کہتے ہیں:

---

[14] غلام رسول مہر، دیوان غالبؔ، ص ۱۳۵

[15] ماخذ سابق، ص ۳۲

توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا[۱۶]

بوقتِ ازل جس ہستی (انسان) میں جتنی ہمت تھی اسی کے مطابق اس کی تقدیر بنی۔ ایک قطرہ آنکھ کا آنسو بنا، دوسرا قطرہ صدف میں گوہر بنا۔ غالبؔ کہتے ہیں دونوں قطروں کی تقدیر ان کے ہمت کے مطابق بنی جب کہ دونوں قطرہ ہیں۔ غالبؔ یہاں 'ہمت' کو جدوجہد کی اصطلاح دیتے ہیں۔ اس لیے اپنی ہمت سے پیکرِ خاکی میں جان پیدا کرنے کی بات کرتے ہیں۔

لہٰذا عصری تقاضہ یہ ہے کہ غالبؔ کی فلسفیانہ بصیرت کو عام کیا جائے جس سے سماج میں پھیلی ہوئی برائیاں دور ہو سکیں اور ملک میں امن و چین قائم ہو سکے۔ ہر جانب شادابی اور خوش حالی رو نما ہو سکے۔ ترک و تجرید کے غلط معنی اور مفاہیم سے اجتناب برتے جائیں اور اس کے مثبت اثرات مرتب ہوں سکیں۔ جمود و سکوت، بے عملی، کم ہمتی اور تعطل کے طلسم کو چاک کریں اور یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کا پیکر بنیں۔ قدامت پسندی کے بجائے جدت پسندی کو بروے کار لائیں۔ تقدیر پرستی کے برخلاف ہم اپنی دنیا آپ پیدا کریں اور زیست کو جاوداں، پیہم دواں اور ہر دم جواں کے مصداق بنائیں۔

[۱۶] ماخذ سابق، ص ۶۳

جدید عربی ادب میں احتجاجی شاعری

ڈاکٹر محمود حافظ عبد الرب مرزا

شعبۂ عربی و فارسی، الٰہ آباد یونیورسٹی

mmjamaliindia@gmail.com

احتجاج، عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ متعدد معانی پر مشتمل ہے جیسے ''اعتراض، انکار، استدلال، حجت یا دلیل پیش کرنے کا عمل وغیرہ۔ اس کا ایک معنی مخالفانہ آواز اٹھانا، ناپسندیدگی کا اظہار کرنا، کسی خاص گروہ یا فرد کی کسی ناپسندیدہ بات کے خلاف زبانی یا تحریری ناراضگی کا اظہار کرنا بھی ہے[۱]''۔ اب یہ لفظ شاعری کی خاص اصطلاح بن گیا ہے۔ احتجاج ہر دور میں اپنی آواز بلند کرنے کا نہایت کارگر ہتھیار رہا ہے۔ عصر حاضر میں اس کا اکثر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ چند سال قبل عرب بہار تحریک اس کی واضح مثال سامنے آئی جس نے عربوں میں انقلاب کی ایک روح پھونک دی۔

احتجاج دراصل سماجی بے انصافی، سیاسی بد عنوانی، مذہبی انتہا پسندی، انسانی حقوق کی پامالی، آواز یا قلم کی آزادی پر پابندی لگانے، رقیب کی رقابت اور محبوب کی جفاکاری وغیرہ کے خلاف ایک فطری رد عمل ہے۔ سماج کی ظالمانہ صورت حال کے پیچھے احتجاج اور مزاحمت کے جذبات کار فرما ہوتے ہیں۔ احتجاج کی تاریخ بہت قدیم ہے، ہر دور میں احتجاج رہا ہے۔ ہندوستانی ادب میں احتجاج کی ابتدا کب ہوئی؟ اس کے بارے میں مکمل وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ ادب کی تاریخ میں ایک قوی محرک اختلاف رہا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ادب کی تاریخ اور عملی اطلاق پر نظر ڈالیے تو اس حقیقت سے انکار مشکل ہوگا کہ ادب کا ایک قوی محرک اختلاف اور انحراف Dissent کا جذبہ بھی ہے۔[۲]

احتجاج ابتداء سے ادب کا حصہ رہا ہے۔ ایسا کوئی عہد نہیں جس میں کسی نہ کسی شکل میں احتجاج موجود نہ

---

[۱] ریختہ ڈکشنری: https://www.rekhtadictionary.com

[۲] اردو ادب، احتجاج اور مزاحمت کے رویے، ادب میں اختلاف، انحراف اور احتجاج کی معنویت از قمر رئیس، مرتبہ: ارتضیٰ کریم، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۔۲۰

ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی ادب میں اُس کا آہنگ بہت بلند نہ ہو اور وہ صرف بین السطور ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی نوعیت اشارے، کنائے اور علامت کی ہو یا وہ واضح احتجاج کی شکل میں ہو[۳]۔

احتجاج مختلف فنون کے معرضِ وجود میں آنے کا اہم سبب بھی ہے کیونکہ مختلف حالات کی وجہ سے مصنف یا شاعر کے احساسات وجذبات کے سمندر کی موجیں مضطرب ہوتی ہیں اور ان کے اندر خیالات کا ایک طوفان اٹھتا ہے۔ تکلیف وپریشانی، ظلم وزیادتی یا انسانیت سوز واقعات کے رونما ہونے پر مصنف یا شاعر کا احتجاج ایک فطری ردعمل ہوتا ہے جس کی گونج اور چیخ ہر ظالم کے کانوں تک پہنچتی ہے یا اُس سماجی بُرائی کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہوتی ہے جو انسانیت کے چہرے کو داغدار کرتی ہے۔ اِسی لیے ادیب کو اپنے زمانے کا ضمیر اور اپنے معاشرے کی آواز بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے عہد کا سب سے حساس اور ذہین محتسب ہوتا ہے۔ اس کی نظر سے کوئی ایسا منظر نہیں چوکتا، جہاں انسانیت سرنگوں اور انسانی وقار اور آزادی معتوب ہو۔ خواہ وہ کسی بھی سماج کا شہری ہو، کسی بھی نظریہ کا حامی ہو[۴]۔

عالمی ادب کا ایک بڑا حصہ احتجاجی ادب ہے اور یہ صرف جنگی ادب تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ معاشی، سماجی، سیاسی اور فکری حقیقت کا ایک جمالیاتی شکل میں تنقیدی ادب ہے اور اس کا مقصد مصنف یا شاعر کی اجتماعی رنج والم سے نجات کی تلاش ہے۔

عربی میں احتجاجی شاعری کے مشہور شعراء کی فہرست میں عہد جاہلی کے نامور شاعر عمرو بن کلثوم اور جدید دور کے چند مشہور شعراء میں محمود دَرویش، توفیق زیاد، سمیح القاسم، اَمل دُنقل، فَدوَی طُوقان، نزار قبّانی، ابوالقاسم الشابی، مِہذل الصقور وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے جنہوں نے اپنے دور کے حالات کا بخوبی مطالعہ کیا اور عمدہ احتجاجی اور مزاحمتی اشعار کہے۔

عربی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو بہ ظاہر اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں کسی خوبصورت منظر کی عکاسی ہوتی ہے جو تشبیب، غزل، مدحیہ یا فخریہ اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ دوسری قسم وہ جس میں کسی برائی یا سماجی ابتری یا ظلم کے خلاف صدائے احتجاج نظر آتی ہے، جس میں ہجویہ اشعار ہوتے ہیں۔ اس

---

[۳] اردو ادب، احتجاج اور مزاحمت کے رویے، احتجاج کی منفرد آواز: جوش ملیح آبادی از شارب ردولوی، مرتبہ: ارتضیٰ کریم، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۲۔

[۴] اردو ادب، احتجاج اور مزاحمت کے رویے، ادب میں اختلاف، انحراف اور احتجاج کی معنویت از قمر رئیس، مرتبہ: ارتضیٰ کریم، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۵۔

پس منظر میں عہد جاہلی کے عظیم شاعر عمرو بن کلثوم کے معلقہ کو احتجاجی اور مزاحمتی شاعری کا اولین نقوش کہا جا سکتا ہے۔

عربی ادب کی تاریخ میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ تم عرب کا کوئی ایسا شخص بتا سکتے ہو جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنے کو اپنی توہین سمجھے؟ وہ کہنے لگے شاعر عمرو بن کلثوم کی ماں لیلیٰ کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا کرنے کو ذلت اور عار سمجھے گی کیوں کہ اس کا باپ مہلہل بن ربیعہ، اس کا چچا وائل اور اس کا خاوند کلثوم بن مالک عرب کا مشہور شہسوار ہے اور اس کا بیٹا عمرو بن کلثوم اپنی قوم کا مایہ ناز سردار ہے۔ یہ سن کر عمرو بن ہند نے عمرو بن کلثوم کو کہلا بھیجا کہ آپ اپنی والدہ کے ساتھ تشریف لائیں، میری والدہ اُن سے ملنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ عمرو بن کلثوم خاندان تغلب کی ایک جماعت کے ساتھ جزیرہ سے عمرو بن ہند کے یہاں پہنچا۔ عمرو بن ہند کے حکم سے فرات اور حیرہ کے درمیان شامیانے لگوا دیے گئے اور قبیلہ کے سرکردہ افراد کو بھی بلوا لیا گیا۔ وہ سب جمع ہو گئے، اُدھر اُس نے اپنی ماں کو سکھا دیا تھا کہ تم لیلیٰ بنت مہلہل سے کوئی کام کہنا۔ جب لیلیٰ شامیانے میں داخل ہوئی اور اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ گئی تو عمرو بن ہند کی ماں نے لیلیٰ سے کہا: ''ذرا یہ سینی تو مجھے اٹھا کر لا دو'' لیلیٰ چلائی: ''ہائے مجھے ذلیل کرتے ہیں''۔ جب اس کے بیٹے عمرو بن کلثوم نے یہ سنا تو اسے غصہ آ گیا اور وہیں بھرے دربار میں عمرو بن ہند کو قتل کر دیا۔ واپسی کے بعد اس نے اپنا شہرۂ آفاق معلقہ کہا، جس کی ابتدا تغزل اور مے نوشی سے کی، پھر اُس نے عمرو بن ہند کے ساتھ جو کچھ گذرا اُس کو بیان کیا اور اپنی قوم اور نسب کی بڑائی کا فخریہ تذکرہ کیا[۵]۔ اِسی معلقہ میں احتجاجاً اس نے مندرجہ ذیل اشعار کہے[۶]:

بِأَيِّ مَشِيْئَةٍ عَمْرُو بْنَ هِنْدٍ نَكُوْنُ لِقَيْلِكُمْ فِيْهَا قَطِيْنَا	اے عمرو بن ہند یہ تیری کون سی تمنا ہے کہ ہم ترے ماتحتوں کے غلام بن جائیں۔
تُهَدِّدُنَا وَتُوْعِدُنَا رُوَيْداً مَتَى كُنَّا لِأُمِّكَ مَقْتَوِيْنَا	تو ہمیں دھمکیاں دیتا ہے اور ڈراتا بھی ہے۔ سنو، ہم کب تیری ماں کے غلام تھے (کہ تیری یہ

[۵] الکامل فی التاریخ، ابن اثیر، جلد ۱، ص ۵۴۸؛ محمد علی الحسنی، دیوان العرب معلقۃ عمرو بن کلثوم، ابوظبی، ہیئۃ ابوظبی للسیاحہ والثقافہ، دار الکتب الوطنیہ، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴-۱۵۔

[۶] شرح المعلقات السبع، الزوزوني، لجنۃ التحقیق فی الدار العالمیۃ، ص ۱۲۱۔

دھمکیاں برداشت کریں اور یہ جھڑکیاں سہیں)

فَإِنَّ قَنَاتَنَا يَا عَمْرُو أَعْيَتْ	اے عمرو بن ہند ہمارے نیزے نے تجھ سے پہلے بھی
عَلى الأَعْدَاءِ قَبلَكَ أَنْ تَلِيْنَا	دشمنوں کے مقابلے میں لچک دکھانے سے انکار کر دیا تھا۔

اسی طرح امرؤالقیس کے معلقہ میں بھی ہمیں احتجاج کے اثرات ملتے ہیں۔ شاعر اپنی محبوبہ کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ تجھے میری مجبوریٔ عشق کا پوری طرح سے احساس ہو گیا ہے، شاید اسی لئے تو نے مجھے اور زیادہ ستانا شروع کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی محبوبہ سے احتجاجاً اپنی بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے[۲]:

أَغَرّكِ مِنّي أَنَّ حُبَّكِ قَاتِلِيْ	یقیناً میری جانب سے تجھے یہ دھوکہ ہو گیا ہے کہ تیری محبت
وأَنَّكِ مَهْمَا تَأْمُرِي القَلبَ يَفْعَلِ	مجھے قتل کئے دیتی ہے اور یہ کہ جو کچھ تو میرے دل کو حکم دے گی وہ ضرور کرے گا۔
وأَنَّكِ قَسَّمتِ الفُؤَادَ؛ فَنِصْفُهُ	اور اس بات کا بھی تجھے غرہ ہے کہ تو نے میرے دل کو تقسیم
قَتِيْلٌ وَنِصفٌ بِالحَدِيْدِ مُكَبَّلُ	کر دیا ہے۔ آدھا حصہ مقتول ہے اور دوسرا پابہ زنجیر ہے۔

مزاحمتی شاعری جدید عربی ادب کا ایک عظیم محور و مرکز اور ایک ایسا وسیع ترین شاعرانہ باب ہے جس کے اِرد گرد شاعروں کا کلام گھومتا رہتا ہے۔ اِس قسم کی شاعری کا سیدھا ٹکراؤ استعمار و استبداد سے ہے، اس لیے مزاحمتی شاعر آزادی کا داعی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے کے مسائل کو اٹھانے والا ہوتا ہے اور اپنی تقدیر کو اپنی قوم کی تقدیر کے ساتھ جوڑ کر دیکھتا ہے۔ جدید عربی ادب میں مزاحمتی شاعری کو(أدب المقاومة) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ حقیقت میں مزاحمت اُن آزاد سماجی و ثقافتی رویوں کے جبر یا استحصال کے خلاف احتجاج کا نام ہے جو سیاسی و عمرانی دباؤ کے تحت انسانی زندگی میں در آتا ہے۔ اِسی جبری برتاؤ اور دستور کو جب ایک ادیب اپنے الفاظ میں ایک جدوجہد کا نام دیتا ہے تو اُسے اہل ادب مزاحمتی ادب کی شکل میں قبولیت بخشتے ہیں۔

ادب میں احتجاج فرسودہ سماجی قوانین، قدامت پرست عائلی رسم و رواج، انسانیت سوز سلوک، عدم مساوات، سیاسی جبر، ظالمانہ سلوک، الم انگیز لمحے یا کبھی کبھی محبت کی پابندی کے خلاف احتجاجاً نثر یا نظم کے پیرایے میں صراحتاً یا اشارۃً اپنی بات کہنا بھی شامل ہے۔ اِسی طرح غصب شدہ انسانی حق کا دفاع اور صریح ناانصافی کے خاتمے کا مطالبہ کرنا بھی احتجاج ہے۔ احتجاجی شاعری دراصل مزاحمت کا ایک مرحلہ

---

[۲] شرح المعلقات السبع، الزوزوني، لجنة التحقيق في الدار العالمية، ص ۲۰۔

ہے جس کا آغاز انسان کے احساس اور شعور سے ہوتا ہے پھر یہ احساس اضطراب، تڑپ اور بے اطمینانی میں تبدیل ہو کر احتجاج کے مرحلہ تک پہنچتا ہے۔اِس مرحلہ کے آگے کا مرحلہ مزاحمت ہوتا ہے جو انقلاب تک پہنچ کر مکمل ہوتا ہے۔

عربوں کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب عوام اپنے حقوق کے تئیں بیدار ہونے لگے تو احتجاجی یا مزاحمتی ادب پوری طرح سے واضح ہو کر عوامی شکل اختیار کر گیا۔ بہت سے شاعروں اور مصنفوں نے ناانصافی اور ظلم وزیادتی کے خلاف احتجاج کرنا اور اپنا قلم اٹھانا شروع کر دیا۔ یہ بات صرف سیاسی مسئلوں پر آکر نہیں رُکی بلکہ اُس سے آگے بڑھ کر مختلف سماجی حالات کے خلاف احتجاج کا آغاز ہو گیا۔ مصر کے نامور ناول نگار احسان عبدالقدوس کا ناول، جس کا عنوان (في بيتنا رجلٌ) یعنی ''ہمارے گھر میں ایک مرد ہے''ہے، مصری انقلاب سے پہلے کے سب سے اہم احتجاجی ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔اس میں انھوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے سماج میں مزاحمتی بیداری آتی ہے اور کس طرح ایک فرد سے ایک خاندان تک اور پھر پورے معاشرے میں پھیل جاتی ہے [۸]۔

عربی شاعری میں احتجاجی یا مزاحمتی ادب کا ذکر ہوتا ہے تو سرزمین فلسطین پر اسرائیلیوں کا غاصبانہ قبضہ ہی اکثر اُس کا محور و مرکز ہوتا ہے۔ مسئلہ فلسطین نے ہر حساس شخص کو متاثر کیا ہے۔ مسئلہ فلسطین عالمی ادب کا موضوع رہا ہے۔اس مسئلے نے عربی ادب کی ترقی کو نئی سمت عطا کی ہے۔اِس سے احتجاجی اور مزاحمتی ادب میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ سرزمین فلسطین پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضے اور وسیع تر اسرائیلی منصوبوں کے خلاف قلم کاروں نے احتجاج درج کرایا ہے۔ شعراء نے غزہ پر اسرائیلی جارحیت اور اسرائیل کے جنگی جرائم کی مذمت کی ہے۔ ساتھ ہی فلسطینیوں کی جدوجہد، وطن سے بید خلی، بڑی تعداد میں ان کا ہجرت کرنے پر مجبور ہونا، آزادی، مزاحمت، وطن کے لئے جذبۂ شہادت اور ایمان کی طاقت کو سلام کیا ہے اور اُن کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہوئے ان کے احساسات وجذبات کی ترجمانی کی ہے۔ فلسطینیوں سے اظہار یکجہتی بھی کیا ہے۔ فلسطینیوں کی جنگ تلواروں کے ساتھ ساتھ لفظوں سے بھی لڑی جاتی رہی ہے۔ معصوم فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم دیکھ کر اُن شعراء کا جگر پھٹ جاتا ہے اور ان کا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

فلسطین کے حق میں احتجاجی اور مزاحمتی شاعری کی سب سے اہم آواز فلسطینی شاعر محمود درویش

---

[۸] فی بیتنا رجل، احسان عبدالقدوس، اخبار الیوم، قطاع الثقافہ، قاہرہ، بدون تاریخ۔

(۱۹۴۱۔۲۰۰۸) کو مانا جاتا ہے۔وہ عربی زبان کے نمائندہ اور بے باک شاعر تھے۔اُن کا اپنا نقطۂ نظر تھا۔ اُنہوں نے فلسطین کے غم کو اپنی زندگی کا غم اور ان کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کو اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔اِسی لئے اُن کو فلسطین کی سانس بھی کہا گیا ہے۔احتجاج اُن کی فطرت اور خمیر میں شامل تھا۔ایک مرتبہ جب کسی اسرائیلی نے اُن سے اُن کے شناختی کارڈ کے بارے میں پوچھا تو اس کے جواب میں انہوں نے جو اشعار اُس وقت کہے تھے احتجاجی اور مزاحمتی شاعری کے ایک نہایت ہی عمدہ نمونہ کے طور پر سامنے آئے۔انھوں نے "بطاقة هوية" (شناختی کارڈ) کے عنوان سے نظم لکھ ڈالی۔اس میں وہ کہتے ہیں[۹]:-

سجّل أنا عربي	درج کرو میں عرب ہوں
سلبتَ كُروم أجدادي	تم نے میرے اجداد کے باغات چرا لیے ہیں اور وہ زمین بھی جہاں میں اپنے تمام بچوں کے ہمراہ کاشتکاری کیا کرتا تھا۔
وأرضاً كُنتُ أفْلَحُها	
أنا وجميع أولادي	تم نے میرے لیے اور میرے تمام پوتوں کے لیے
ولم تَتْرُكْ لنا ولِكلِّ أحفادي	کچھ باقی نہیں چھوڑا سوائے پتھروں کے۔
سوى هذه الصُّخور	تو کیا تمہاری حکومت۔جیسا کہ کہا گیا ہے، اِن پتھروں کو بھی چھین لے گی۔
فهل ستأخذها حُكومَتكُم. كما قيلا ؟	لہٰذا درج کرو: صفحہ اول پر سب سے اوپر
إذنْ .. سَجِّل .. برأسِ الصفحةِ الأُولى	میں لوگوں سے نہ تو نفرت کرتا ہوں
أنا لا أكْرَهُ الناسَ .. ولا أسطُو على أحدٍ	اور نہ ہی کسی پر ظلم و ستم ڈھاتا ہوں
ولكنّي .. إذا ما جِعتُ	لیکن۔۔جب بھی مجھے بھوک لگے گی
آكلُ لحمَ مُغْتَصِبِيْ... حَذارَ حَذارَ...	تو غاصب کا گوشت چبا جاؤں گا
مِن جُوعِي ومِن غَضَبِيْ	خبر دار، خبر دار، میری بھوک سے اور میرے غصے سے۔

سرزمین فلسطین کا دکھ درد اور تڑپ فلسطینی شاعرہ فَدوی طُوقان (۱۹۱۷۔۲۰۰۳) نے بھی اپنے اشعار

---

[۹] محمود درویش، الدیوان، الاعمال الاولی، ریاض الریس للکتب والنشر، ۲۰۰۵ء، ص ۸۰-۸۴۔

کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں فلسطینی باشندوں کا درد و کرب، خانما بربادی، اسرائیلی جارحیت اور سرزمین فلسطین پر یہودیوں کے ناجائز قبضے کی عکاسی کی ہے۔ اپنی مشہور نظم "نداء الأرض" (زمین کی پکار) میں شاعرہ اپنی سرزمین کی طرف واپسی کا مطالبہ کرتی ہے اور ظالموں کے ظلم وزیادتی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہتی ہے[1]:

أتُغصبُ أرضيْ أيُسلبُ حقّي وأبقى أنَا
حَليفَ التَّشَرُّدِ أصْحَبُ ذِلَّةَ عَارِيْ هُنا
أأبقى هنا لأموتُ غريباً بأرضٍ غَريبةٍ
أأبقى ؟ ومَنْ قَالها..
سأعُودُ لأرضِي الحبيبةِ
سيَحني عليَّ ثَراها الكريمُ ويُؤوي رُفاتي
سأرجِع لا بُدَّ مِن عَودتي
سأرجِع مهما بدَتْ مِحنتي

کیا میری زمین اور میرا حق چھین لیا جائے گا اور میں بے گھر ذلت و رسوائی کو لیے زندہ رہوں گی۔ کیا میں یہاں ایک اجنبی ملک میں اجنبی کی طرح مرنے کے لیے زندہ رہوں گی۔ کیا میں سچ میں باقی رہوں گی؟ اور کس نے یہ کہا؟ میں اپنی پیاری سرزمین کو واپس آؤں گی۔
اُس کی بے پناہ کرم والی مٹی مجھ پر محبت لٹائے گی اور میری لاش کو پناہ دے گی۔
میں واپس آؤں گی۔ مجھے واپس آنا ہی ہے۔
میں واپس آؤں گی چاہے میری مصیبت کتنی ہی مشکل لگے۔

شامی شاعر نزار قبانی (۱۹۲۳۔۱۹۹۸) نے کسی بھی اہم سیاسی مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا تو مسئلہ فلسطین کو کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ اُس نے بیشتر اشعار میں فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کے خلاف اپنا موقف واضح کر دیا یہاں تک کہ مسلح جدوجہد کی حمایت کا اعلان بھی کیا۔ اِس سلسلے میں اُس نے نظم "المهرولون" (سراب کے پیچھے بھاگنے والے) لکھی جس کی بازگشت پورے عرب ممالک میں اب تک سنائی دیتی ہے۔ اُس نے عربوں کو ایک بزدل قوم سے تعبیر کیا جب کہ عرب عہد جاہلی سے بہادری اور جرأت مندی کے لئے جانے جاتے ہیں۔ اُس نے اوسلو معاہدہ کے بعد اسرائیلیوں سے مصالحت کے خلاف اپنے موقف کا اعلان کیا۔ وہ کہتا ہے[11]:

---

[1] فدوی طوقان، الاعمال الشعریۃ الکاملۃ، دار الفارس للنشر والتوزیع، عمان، اردن، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲۱۔
[11] عبدہ الزراع، وجوه مضيئة في الادب والفن، دار دلتا للنشر، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۔

سَقطت آخِرُ جُدرانِ الحَياءِ
شرم وحیا کی آخری دیواریں گر چکی ہیں۔

وفَرِحنا...ورَقَصْنا وتباركنا بتوقيعِ سلامِ الجُبناءِ
اور ہم نے خوشیاں منائیں... رقص کیا اور بزدلوں کے امن کے دستخط پر ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔

لم يَعُد يُرعِبُنا شيء... ولا يُخجلنا شيء
اب کوئی بھی چیز ہمیں خوف زدہ نہیں کرتی... اور نہ ہی کوئی چیز ہمیں شرمندہ کرتی ہے۔

فقد يَبِست فِينا عُروقُ الكِبرياء..!
کیونکہ ہماری رگ حمیت سوکھ گئی ہے..!

فلسطینی شعراء کے علاوہ اس فہرست میں سعودی عرب کے نوجوان معاصر شاعر مہذّل الصقور کا نام بھی شامل ہے جن کا کلام عربی کے علاوہ نبطی زبان میں بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ انہوں نے اپنے جذبات کو ایک ایسے احتجاجی اور انقلابی نظم کے پیکر میں ڈھالا ہے جس نے آج کل سوشل میڈیا میں زبردست ہلچل پیدا کر دی ہے۔ اس نظم کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھیں جو احتجاجی شاعری کا عمدہ نمونہ ہیں:

أَتَظنُّ أنكَ عِندما أحرقتني
ورَقصتَ كالشيطانِ فوقَ رُفاتي
وتركتني للذاريات تذُرُّني
كُحلاً لعينِ الشمس في الفَلَوَاتِ

تمھیں کیا لگتا ہے کہ جب تم نے مجھے جلادیا؟
اور میری لاش پر شیطان کی طرح ناچتا رہا۔
اور تم نے مجھے ہواؤں کے حوالے کر دیا جنہوں نے مجھے بکھیر دیا اور بیاباں میں سورج کی آنکھوں کے سرمے کے لئے چھوڑ دیا۔

أَتظنُّ أنَّكَ قد طَمَستَ هَويتي
ومحوتَ تاريخي ومُعتقداتي
عبثاً تُحاوِلُ.... لافناءَلثائرٍ

تم کیا سمجھتے ہو کہ تم نے میری شناخت، میری تاریخ اور میرے عقائد کو مٹادیا ہے۔
بیکار کی کوشش کرتے ہو... انقلابی کبھی فنا نہیں ہوتا۔

أنا كالقيامةِ ذاتَ يوم آتِ
أنا مثلُ عيسى عائدٌ وبقوةٌ
مِنْ كلِّ عاصفةٍ أَلُمُّ شَتاتي

میں قیامت کی طرح ہوں، ایک دن لوٹ کر ضرور آؤں گا۔ میں حضرت عیسی کی طرح ہوں، پوری طاقت کے ساتھ ہر اُس طوفان سے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹتے ہوئے واپس آؤں گا۔

سأعودُ أقدَمَ عاشقٍ متمردٍ
سأعودُ أعظمَ أعظمِ الثوراتِ

میں سب سے پرانے باغی عاشق کی طرح واپس آؤں گا۔
میں عظیم ترین انقلابات میں سے سب سے بڑے انقلاب کو لے کر واپسی کروں گا۔

سأعودُ بالتوراةِ والإنجيلِ والـ
قُرآنِ والتسبيحِ والصلواتِ
سأعودُ بالأديانِ ديناً واحداً
خالٍ مِنَ الأحقادِ والنعراتِ
رجلٌ مِنَ الأُخدودِ ما مِن عَودتي

بُدّ...أنا كُلُّ الزَّمانِ الآتي

میں توریت، بائبل، قرآن اور حمد ودعا کے ساتھ واپس آؤں گا۔ میں تمام ادیان کو ایک دین کی شکل میں لے کر لوٹوں گا جو تمام رنجشوں اور جھگڑوں سے پاک ہو گا۔ میں اخدود کی جماعت کا ایک فرد ہوں، مجھے لوٹ کر آنا ہی ہے... میں آنے والا ہر وقت ہوں۔

اِس ضمن میں مصری شاعر امل دُ نقل (۱۹۴۰۔۱۹۸۳) کی اُس پر جوش نظم کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں وہ مصر اور اسرائیل کے درمیان ''کیمپ ڈیوڈ'' امن سمجھوتے کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اِس نظم کا عنوان ہے "لا تُصالح"، (مصالحت نہ کرو)[۱۲]:

لا تُصالح .. ولو منحوكَ الذهب
أتُرى حين أفقأُ عينيكَ
ثم أُثبِّتُ جوهرتين مكانهما
هل تَرى . .؟ :هي أشياء لا تُشترى
ذكرياتُ الطفولة بين أخيكَ وبينكَ

مصالحت نہ کرو۔
چاہے وہ تمہیں سونا ہی کیوں نہ دے دیں۔
ذرا سوچو: جب تمہاری آنکھیں پھوڑ کر اس کی جگہ
دو جواہرات رکھ دیئے جائیں
تو تمہیں کیسا محسوس ہو گا؟
یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے آپ کے اور آپ کے بھائی کے درمیان کی بچپن کی یادیں خریدی نہیں جا سکتیں۔

تونس کے دور جدید کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ابو القاسم الشابی (۱۹۰۹۔۱۹۳۴) کی شاعری میں مزاحمتی شاعری کے نمونے بالکل صاف نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ انتخاب کی آزادی پر پختہ یقین رکھتا تھا، معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کے خلاف آواز بلند کرتا تھا، ناانصافی اور ظلم وزیادتی کے خلاف مزاحمت کرتا، اپنی قوم کی شان کو اپنی آن بان اور وقار سمجھتا اور سماجی حقیقت کے ساتھ مفاہمت کرنے سے انکار کرتا تھا۔ اِسی نقطۂ نظر سے اُس کا شمار اُن مزاحمتی شاعروں میں کیا جاتا ہے جن کا کلام مزاحمتی خصوصیات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

ابو القاسم الشابی کی شاعری میں مزاحمت کا اہم محور اس کی حب الوطنی ہے، استعمار کے خلاف

---

[۱۲] امل دنقل، الاعمال الشعرية الكاملة، مکتبۃ مدبولی، قاہرہ، ط۳، ص ۳۲۴-۳۲۵۔

جدوجہد اور قومی عزائم کی نمائندگی ہے۔اس نے اپنے ملک کی محبت کا ترانہ گایا اور اعلان کیا کہ وہ ملک کے اُن سپاہیوں میں سے ہے جو اُس کے دفاع کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر سکتے ہیں۔اُس کی ایک نظم کے، جس کا عنوان "إلی الشعب"، (عوام کی جانب) ہے، چند اشعار ملاحظہ کریں[۱۳]:

أين يا شعبُ قلبُكَ الخافقُ الحسَّاسُ أين الطُموحُ والأحلامُ؟	اے قوم! کہاں ہے تمہارا دھڑکتا ہوا احساس دل، کہاں ہیں تمہارے عزائم اور خواب؟
أين يا شعبُ رُوحُكَ الشاعرُ الفنَّانُ أينَ الخيالُ والإلهامُ؟	اے قوم! کہاں ہے تمہاری فنکار شاعری کی روح، کہاں ہے تخیل اور الہام؟
أين يا شعبُ فَنُّكَ الساحرُ الخلاّقُ أين الرُّسومُوالأنغامُ؟	اے قوم! کہاں ہے تمہارا دلکش تخلیقی فن، کہاں ہیں تصویریں اور دھنیں؟

اس شاندار نظم کو شاعر کی حب الوطنی سے متعلق جذبات کا آئینہ سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہ واضح اور وسیع خطوط پر مرکوز ہے جو ترقی کی ضروریات کے بارے میں اُس کے حسّی کیفیات کی نشاندہی کرتی ہے اور اُن مقاصد کو بھی اجاگر کرتی ہے جو شاعر اپنے معاشرے کے لیے چاہتا ہے۔

ابو القاسم الشابی اپنے ملک میں موجود جمود، زوال، غربت، جہالت اور بیماری سے بے حد متاثر تھا جو اُس کے ملک کو اپنی چپیٹ میں لئے ہوئے تھے، لٰہذا وہ کرب میں مبتلا اور اس کی اصلاح کے لیے مسلسل کوشاں تھا۔ وہ اپنی نظموں میں اپنے ملک کے لوگوں کو حالات بدلنے اور آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کی ہدایت کرتا ہے نیز احتجاج اور مزاحمت کے جذبات کا برملا اظہار کرتا ہے۔اس کی مندرجہ ذیل نظم بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے[۱۴]:

إذا الشعبُ يوماً أرادَ الحياةَ فلا بُدّ أن يستجيبَ القدرْ	اگر عوام ایک دن جینا چاہ جائیں تو تقدیر کو اُن کے آگے سر جھکانا ہی ہو گا۔
ولا بُدّ لليلِ ان ينجليْ ولا بد للقيد أن ينكَسِرْ	رات کو گذرنا ہی ہو گا، اور بیڑیوں کو ٹوٹنا ہی ہو گا۔
ومن لم يعانقهُ شوقُ الحياةِ تبخَّر في جوِّها واندَثَرْ	جس کو جینے کی تمنا نہ ہو، وہ فضا میں بھاپ بن کر بکھر جاتا ہے۔

---

[۱۳] دیوان ابی القاسم الشابی ورسائلہ، قدمہ وشرحہ: مجید طراد، دار الکتاب العربی، بیروت، ط ۲، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۳۔

[۱۴] ماخذ سابق، ص ۹۰۔

فويل لمن لم تَشُقهُ الحياةُ
من صَفعةِ العَدَمِ المنتصرْ
كذلك قالت ليَ الكائناتُ
وحدَّثني رُوحُها المستترْ
ومن لا يحبُّ صُعودَ الجبالِ
يَعِشْ أبَدَ الدَّهرِ بَيْنَ الحُفَرْ

زندگی کا نہ ہو جس میں جذبہ، عدم کے تھپیڑے سے وہ بچ نہیں سکتا۔
اِسی طرح، کائنات نے مجھ سے کہا
اور اُس کی پوشیدہ روح نے مجھ کو بتایا۔
بلندیوں کو سر کرنا جس کی چاہت نہ ہو وہ ہمیشہ گڈّھوں میں جیتا رہے گا۔

یہ نظم جس کا عنوان "إرادة الشعب" یعنی (عوام کا عزم) ہے استعمار، تسلط اور غلامی کے خلاف ایک بلند احتجاج ہے۔ ساتھ ہی اُس میں انقلاب کی ایک ایسی صدا بھی ہے جس میں یہ اعلان ہے کہ اب عوام کو محکوم بنا کر نہیں رکھا جا سکتا۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے عرب شعراء ہیں جو احتجاجی اور مزاحمتی شاعری کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں، لیکن اس مختصر مقالہ میں سب کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ احتجاجی اور مزاحمتی شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ وہ سماج کا آئینہ ہوتی ہے اور اس کے پیچھے سماجی و اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کا جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ احتجاجی شاعری کا مقصد محض شاعرانہ ذوق کی تسکین نہیں بلکہ معاشرہ کے فساد پسند افراد کو ان کے جرموں سے متنبہ کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اس سے باز آئیں اور معاشرے کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بنیں۔

کتابیات:

۱۔ ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، جلد ۱، تحقیق ابی الفداء عبد اللہ القاضی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۷ء۔

۲۔ امجد، رشید (مرتب)، مزاحمتی ادب اردو، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء۔

۳۔ الحسنی، محمد علی، دیوان العرب معلقۃ عمرو بن کلثوم، ابوظبی، ھیئۃ ابوظبی للسیاحۃ والثقافۃ، دار الکتب الوطنیۃ، ۲۰۱۲ء۔

۴۔ درویش، محمود، دیوان الاعمال الاولی، ریاض الریس للکتب والنشر، بیروت، ۲۰۰۵ء۔

۵۔ دنقل، امل، الاعمال الشعریۃ الکاملۃ، مکتبۃ مدبولی، قاہرہ، ط۳، ۱۹۸۵ء۔

۶۔ الزراع، عبدہ، وجوہ مضیئۃ فی الادب والفن، دار دلتا للنشر، شبین الکوم-المنوفیۃ (مصر)، ۲۰۱۵ء۔

۷۔ الزوزونی، شرح المعلقات السبع، لجنۃ التحقیق فی الدار العالمیۃ۔ بیروت، ۱۹۹۲ء۔
۸۔ طراد، مجید، دیوان ابی القاسم الشابی ورسائلہ، دار الکتاب العربی، بیروت، ط۲، ۱۹۹۴ء۔
۹۔ طوقان، فدوی، الاعمال الشعریۃ الکاملۃ، دار الفارس للنشر والتوزیع، عمان، اردن، ۱۹۹۳ء۔
۱۰۔ عبدالقدوس، احسان، فی بیتنا رجل، اخبار الیوم، قطاع الثقافہ، قاہرہ، بدون تاریخ۔
۱۱۔ کریم، ارتضیٰ (مرتب)، اردو ادب، احتجاج اور مزاحمت کے رویے، ادب میں اختلاف، انحراف اور احتجاج کی معنویت از قمر رئیس، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۴ء۔
۱۲۔ نعمانی، شبلی، کلیات شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء۔

خواجہ حسن نظامی کا سفر نامہ پاکستان

ڈاکٹر محمد شمشیر علی

اردو مترجم، محکمہ کابینہ اردو ڈائریکٹوریٹ، حکومت بہار

mdshamsheralig@gmail.com

سفر نامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں سفر نامہ نگار اپنے سفر کے حالات، مشاہدات، تاثرات، روداد اور کوائف کو ادب کے تقاضوں کے ساتھ تخلیقی انداز میں قلم بند کرتا ہے۔ سفر نامے کی تعریف اور فن پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انور سدید لکھتے ہیں:

> سفر نامہ سفر کے تاثرات، حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے[1]۔

آغاز وارتقا: جس طرح ہر صنف ادب کا اپنا سلسلۂ ارتقا ہوتا ہے، اسی طرح اس صنف کا زمانۂ آغاز بھی ہے۔ اگر کلی طور پر سفر نامے کے آغاز وارتقا کی بات کی جائے تو یہ صنف بہت قدیم ہے۔ اس کی قدامت موجودہ بعض مقبول اصناف سے کہیں زیادہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ سفر نامے کی تحریری صورت آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پرانی ہے۔ اور دنیا کا پہلا تحریری سفر نامہ آج بھی اپنی اصلی صورت میں محفوظ ہے[2]۔

جہاں تک اردو ادب میں سفر نامہ لکھنے کی تاریخ کی بات ہے تو اکثر مؤرخین زبان اردو کا ماننا ہے کہ اردو میں سفر نامے کا آغاز ۱۸۴۷ء میں ہوا۔ یوسف خاں کمبل پوش وہ پہلا سیاح تھا جس نے اپنے سفر یورپ کے واقعات، تاثرات، مشاہدات اور حالات کو بزبان اردو مسمہ بہ ''عجائبات فرنگ'' (دوسرا نام: تاریخ یوسفی) قلم بند کیا۔ اور اس سفر نامے کی پہلی طباعت پنڈت دھرم نرائن کے زیر اہتمام مطبع العلوم دہلی کالج پریس سے ۱۸۴۷ء میں ہوئی۔ اسے اردو کا پہلا سفر نامہ تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ اس لیے کہ اس

---

[1] انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ: ص۔ ۵۲

[2] اس کے لئے انور سدید کی کتاب 'اردو ادب میں سفر نامہ' کے مقدمے کا مطالعہ کریں۔

سے پہلے کسی اردو سفر نامے کی تصدیق روایت و شواہد سے نہیں ہوتی۔

کوئی بھی تحریر اس وقت تک درجۂ صنف کو نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ اس کے ضروری اور ممیز اوصاف مرتب نہ ہو جائیں۔ جس طرح دیگر اصناف نثر جیسے انشائیہ، خود نوشت، سوانح عمری، خطوط، خاکہ، داستان، افسانہ، ڈراما، مقالہ اور مضمون وغیرہ اپنے اپنے اوصاف لازمہ اور ممیزہ کی بدولت ہی ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں، اسی طرح سفر نامے کے بھی چند اوصاف ممیزہ ہیں جو اسے دیگر اصناف ادب سے ممتاز کرتے ہیں۔

سفر نامہ ایک بیانیہ صنف ہے۔ اس میں آپ بیتی جیسا انداز ہوتا ہے۔ اس کے واقعات صداقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں افسانوی نثر کے عناصر کی رمق ہوتی ہے۔ انداز بیان تخلیقی ہوتا ہے اور نئی زمین، تہذیب اور ثقافت کی دریافت کا ادبی اظہار ہوتا ہے۔ سفر نامے کی سب سے اساسی شرط سفر نامہ نگار کا خود سفر کرنا ہے۔ انور سدید نے سفر نامہ کے چند اہم اوصاف اور شرط کا ذکر یوں کیا ہے:

> سفر نامہ اولین سطح پر ناظرہ کو بروئے عمل لاتا ہے۔ اس لیے کسی ملک کے جغرافیائی نشیب و فراز سفر نامہ نگار کی توجہ سب سے پہلے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور وہ جمادات اور نباتات اور حیوانات کی نئی اقسام کی دریافت میں ایک عجیب نوع کی مسرت محسوس کرتا ہے۔ اس کیفیت کا سلیقہ مندانہ اظہار ایک اچھے سفر نامہ کی بنیادی خصوصیت ہے اور اس سے سفر نامے کو لطافت اور جاذبیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ سفر نئی زمینوں کی دریافت کا وسیلہ ہے اور اس کا بیانیہ ان دریافتوں میں قاری کو شرکت کا موقع عطا کرتا ہے[۳]۔

سفر نامہ بیانیہ صنف ادب ہے نیز سفر نامہ کے لیے سفر بنیادی شرط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ سفر نامے کے تمام واقعات، حالات اور مشاہدات چشم دید ہوتے ہیں، افسانوی ادب کی طرح تخیل پر مبنی نہیں ہوتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے کی بنیاد اپنے آنکھوں دیکھے حالات، واقعات، تہذیب و معاشرت اور مشاہدات پر ہی رکھے۔ ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ سفر نامے میں حقیقی واقعات اس تخلیقی انداز میں پیش کرے کہ قاری کے اندر احساس تحیر پیدا ہو جائے اور تیسرے یہ کہ سفر نامے کے ذریعے قاری کو معلومات میں ان دیکھے ملک سے آشنائی، نامعلوم تہذیب و تمدن سے آگہی اور ناآشنا علوم و فنون کا اضافہ ہو۔

---

[۳] ماخذ سابق، ص۔۵۶

سفر نامے کی بنیادی خصوصیت اس کے واقعات کا صداقت بر مبنی ہونا ہے۔یعنی سفر نامے کے تمام واقعات میں سچائی ہو، کذب بیانی یا تخیل کی آمیزش اس میں نہ ہو اور نہ ہی مؤرخ کی تاریخ نگاری کی طرح ہو کہ تاریخ نگار کو تاریخ لکھتے وقت اس بات کی قطعاً اجازت نہیں ہے کہ وہ تاریخ میں اپنا ذاتی تاثر یا تنافر کسی کے تئیں پیش کرے، بلکہ سفر نامہ نگار کو تاریخ نویس کے برعکس اس کی اجازت ہی نہیں بلکہ حکم ہے کہ وہ واقعات سفر میں صدق بیانی سے تو کام لے مگر اس میں اپنا ذاتی تاثر اور ادبی اسلوب کا پیرایہ اختیار کرے۔

سفر نامہ نگار سے اکثر و بیشتر سفر نامے میں ملک سفر کے سیاسی، سماجی، معاشی حالات، وہاں کے رسم و رواج اور اخلاق و عادات لکھنے میں جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ملک کے جزئیات سے متعارف ہو کر جزئیات کا اطلاق کلیات پر کر دیتا ہے۔ مثلاً چند اشخاص سے مل کر ان کے اخلاق و عادات کا اطلاق وہاں کی تمام قوم پر کر لینا۔ اسی طرح وہاں کے کسی مخصوص علاقے کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کا اطلاق اس ملک کے ہر خطے پر کر لینا۔ علامہ شبلی نعمانی تحریر کرتے ہیں:

> ایک بڑی غلطی جو عموماً سفر نامہ لکھنے والوں کو واقع ہوتی ہے وہ جزئیات سے کلیات کا قائم کرنا ہے۔ سفر میں انسان کو جن اشخاص سے سابقہ پڑتا ہے وہ ان کے اخلاق، عادات، خیالات سے تمام قوم کی نسبت عام رائے قائم کر لیتا ہے حالاں کہ ممکن ہے کہ وہ امور ان ہی چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوں[۴]۔

جزئیات سے کلیات کی نسبت رائے قائم کر لینے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ جب سیاح کسی ملک کا سفر کرتا ہے تو اس ملک کی نسبت پہلے سے ہی اس کے دماغ میں چند مفروضے قائم ہوتے ہیں، مثلاً دوست ملک کی ہمدردی یا دشمن ملک کی دشمنی، اس کی تعلیمی او معاشی ترقی کا یا تنزلی کا احساس۔ پس وہاں پہنچ کر جس چیز کو دیکھتا ہے، جس سے ملاقات کرتا ہے، جن حالات سے گزرتا ہے انھیں سب کی اجمالی واقفیت سے پہلے سے اپنے مفروضے کے زیر اثر وہاں کے حالات، تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات اور طرز معاشرت کے متعلق اچھے یا برے ہونے کا نتیجہ اخذ کر لیتا ہے۔

فن سفر نامہ کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نئی زمین، نئی تہذیب و معاشرت اور وہاں کے جمادات و حیوانات و نباتات اور علاقوں کی جغرافیائی، سماجی اور سیاسی صورت حال کا نقشہ سفر نامہ نگار

---

[۴] علامہ شبلی نعمانی، سفر نامہ روم و مصر و شام: ص۔۷

اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعے اس سلیقے سے کھینچے کہ سفر نامے کا قاری اپنے کو بھی شریک سفر کرلے یعنی سفر نامہ کا قاری بنظر تخیل ملک سفر کی سیر کرلے اور گھر بیٹھے اسے وہاں کے حالات، سماج، معاشرت اور تہذیب و تمدن سے آگہی حاصل ہو جائے۔

سفر نامے کا چوتھا وصف یہ ہے کہ سفر نامہ بیانیہ صنف اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ صیغۂ واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے اس لیے اس میں 'آپ بیتی' کا انداز در آتا ہے اور یہ اس کے حسن کو اور بھی دوبالا کردیتا ہے۔

ادبی اور تخلیقی حیثیت: سفر نامہ ایک خاص صنف ادب ہے۔ اس لیے کہ ادیب جب سفر کرتا ہے تو وہ دنیا کا مشاہدہ اپنی ظاہری آنکھوں سے تو کرتا ہے مگر جب وہ انھیں مشاہدات، واردات اور واقعات کو قلم بند کرتا ہے تو اس کے تجربات اور محسوسات تخلیقی کارگاہ سے مناسب الفاظ کے ذریعے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ قدیم سفر نامے میں میں زیادہ تر سفر کے خارجی کوائف و حالات سفر نگار لکھتا تھا اور داخلی احساسات کا ذکر نہیں کے برابر کیا جاتا تھا، مگر جدید سفر ناموں میں خارجی کے علاوہ ایک ادیب سیاح کے داخلی حسیات پر سفر کے حالات و واقعات اور مشاہدات سے کیا اثر مرتب ہوا اسے ادیب اپنے فنکارانہ طرز کے ذریعے سفر میں شامل کردیتا ہے۔

سفر نامۂ پاکستان (نومبر ۱۹۵۲ء): خواجہ حسن نظامی نے پاکستان کے دو سفر کیے، پہلا ۱۶؍ مئی ۱۹۵۰ء کو اور دوسرا ۱۴؍ نومبر ۱۹۵۰ء کو۔ ان دونوں اسفار کے حالات و واقعات انھوں نے سفر نامے کی صورت میں قلم بند کیے مگر حکومت ہند کو دوسرے سفر کے حالات و روداد کی تحریر پر اعتراض ہوا اس لیے انھوں نے دوسرے سفر کے حالات والے حصے کو خارج کرکے 'سفر نامۂ پاکستان' کے نام سے نئی معلومات کے اضافے کے ساتھ مرتب کرکے دفتر خواجہ حسن نظامی دہلی سے نومبر ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع کیا۔

اس سفر نامے میں مذکورہ دو سفروں کے حالات کو غیر متنازع انداز میں از سر نو لکھا گیا تب جاکر شائع ہوا۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ وہ دور تھا کہ ملک تقسیم ہوا تھا اور بدامنی کا عالم تھا۔ لوگ، اجسام، علاقے، رشتے، تہذیب اور دل سے بھی منقسم ہوگئے تھے۔ نامور شخصیات پر کڑی نظر رکھی جارہی تھی۔ اور پورے برصغیر میں ایک طوفان بے تمیزی برپا تھا۔ اسی وجہ سے بعض ادیبوں پر بھی نزلہ گرا اور بعض کی تحریروں پر بھی پابندی عائد کی گئی۔ اپنے اس سفر کے آغاز اور پھر 'سفر نامۂ پاکستان' کی اشاعت کے متعلق خواجہ حسن نظامی تحریر کرتے ہیں:

میں نے ۱۶؍ مئی ۱۹۵۰ء کو پہلا سفر کیا اور ۴؍ نومبر ۱۹۵۰ء کو دوسرا سفر کیا۔ اور حسب عادت ان سفروں کے حالات اپنے روزناموں میں شائع کئے۔ مگر دوسرے سفر کے حالات کی تحریر حکومت دہلی کی نظر میں قابل اعتراض ہوئی۔ اس لیے میں نے ان سب حصوں کو خارج کر دیا اور سفر نامۂ پاکستان کے نام سے دونوں سفر ناموں کے حالات نئی معلومات کے اضافوں کے ساتھ مرتب کر دیے[۵]۔

آغاز سفر نامہ میں بطور تمہید خواجہ صاحب نے ہندوستان میں غزنی سے پہلے پہل آنے والے اپنے مورث اعلیٰ یعنی حضرت مولانا خواجہ سید علیؒ غزنی کا جو کہ افغانستان میں رہتے تھے، اور ان کے فرزند حضرت مولانا سید خواجہ بدرالدین اسحاق کا جو بغرض تکمیل تعلیم غزنی سے ہندوستان آئے تھے ذکر کیا ہے۔ یہ عہد سلطان غیاث الدین بلبن کا تھا اور پاک پٹن (اب پاکستان میں) میں حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر تشریف رکھتے تھے، ان کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔ حضرت مولانا سید خواجہ بدرالدین اسحاق غزنوی تعلیم کے کسی لاینحل مسئلے کے حل کے لیے دہلی سے غزنی واپس جا رہے تھے تو راستے میں پاک پٹن میں قیام کیا۔ یہ اولیا اور فقرا کے قائل نہیں تھے کہ ایک ملاقاتی نے کہا کہ بابا فریدالدین سے بھی مل لینا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میں بزرگوں کی علمی لیاقت کا قائل نہیں ہوں لیکن چلو جب تم کہتے ہو تو ملاقات کر لیتے ہیں۔ جب مولانا سید بدرالدین اسحاق بابا فرید سے ملنے پہنچے تو سلام کر کے ایک جانب بیٹھ گے۔ بابا فرید نے کہا کہ ابھی اس شخص سے گفتگو کے بعد آپ سے بات کرتا ہوں۔ جب پہلے سے موجود شخص سے بات کر کے خواجہ سید بدرالدین کی طرف مخاطب ہوئے تو خواجہ سید بدرالدین خواجہ فریدالدین کے قدموں میں گر گئے اور کہنے لگے کہ میں جس مسئلے کے حل کے لیے دہلی سے غزنی جا رہا تھا وہ مسئلہ بغیر میرے گفت وشنید اور استفسار کے حل ہو گیا۔ بابا فرید نے کہا کہ فقرا اور درویشوں کو علم کہاں ہوتا ہے وہ تو نرے جاہل ہوتے ہیں، تو پھر خواجہ سید بدرالدین دوبارہ قدم بوسی کر کے اپنی تقصیر کی معافی طلب کی۔ پھر یہ ہوا کہ حسب و نسب خواجہ سید بدرالدین کا معلوم کرنے کے بعد بابا فریدالدین نے اپنی پیاری بیٹی حضرت بی بی فاطمہ سے عقد کرا دیا اور ساتھ ہی اپنے حلقہ مریدین میں شامل کر کے خلعت خلافت و اجازت بھی عطا فرمائی۔ خواجہ سید بدرالدین کے دو لڑکے سید محمد امام اور سید محمد موسیٰ ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں کہ ''اور میں حضرت مولانا خواجہ سید محمد امام کی اولاد ہوں''۔

---

[۵] خواجہ حسن نظامی، سفر نامۂ پاکستان: ص۔۴

خواجہ سید امام اور خواجہ سید محمد موسیٰ کا دہلی آنا یوں ہوا کہ ۲۰ برس کی عمر میں جب حضرت خواجہ نظام الدین اولیا بغرض بیعت حضرت بابا فرید الدین کے آستانے پر پہنچے تو اس وقت وہاں بابا فرید کے داماد یعنی حضرت خواجہ سید محمد امام و سید محمد موسیٰ کے والد خواجہ سید بدر الدین بھی قیام پذیر تھے۔ بابا فرید نے خواجہ نظام کو خواجہ بدر الدین کی تربیت میں دے دیا۔ جب حضرت نظام الدین دہلی آ گئے تب کچھ دنوں بعد بابا فرید اور خواجہ سید بدر الدین وصال فرما گئے اور جانشینی کے لیے بابا فرید کے صاحبزادے آپس میں جھگڑنے لگے اور اس وجہ سے حضرت بی بی فاطمہ اور ان کے دونوں بچے تکلیف میں پڑ گئے۔ جب بات حضرت خواجہ نظام الدین کو معلوم ہوئی تو وہ اپنے مشفق و مہربان اور کرم فرما خواجہ سید بدر الدین کے اہل و عیال کو مشکل اور تکلیف میں پڑا دیکھ کر بہت دکھی ہوئے اور مولانا سید محمد کرمانی کو پاک پٹن بھیج کر حضرت بابا کی بیٹی اور ان کے دونوں بچوں کو اپنے پاس دہلی میں بلا لیا۔

اس طرح کی خاندانی تفصیلات کا متحمل اگرچہ سفر نامہ نہیں ہوتا اور نہ ہی سفر نامے کا مقصد شجرۂ نسب بیان کرنا ہوتا ہے مگر اس خاندانی تفصیل کے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے خود خواجہ حسن نظامی تحریر فرماتے ہیں کہ:

> یہ تمہید اس لیے بیان کی گئی ہے کہ آج جن علاقوں میں پاکستان قائم ہوا ہے وہ میرا وطن قدیم ہے۔ اس واسطے اس علاقے میں میرا سفر تھا[6]۔

اس سفر کی شروعات ۱۶ مئی ۱۹۵۰ء کی صبح سے ہوتی ہے اور ساتھ میں جو ہم سفر اہل خانہ تھے وہ خواجہ صاحب کی لڑکی روح بانو اور ان کے بچے تھے۔ یہ سفر بذریعۂ ہوائی جہاز تھا جو کہ دہلی سے لاہور تک تھا اور پھر پاکستان میں جو دیگر مقامات کے اسفار ہوئے وہ بذریعہ زمینی راستے ہوئے۔ کبھی بس، کبھی کار اور کبھی ٹرین سے۔ لاہور پہنچنے پر استقبال کے لیے خصوصی طور پر خواجہ محمد شفیع صاحب، ان کی بیگم صاحبہ اپنے بھتیجے سید بدر الدین نظامی، ان کی والدہ اور امتیاز بانو نظامی، محمد حسین نظامی اور حکیم منزل شاہ نظامی کا ذکر کیا ہے۔ اسی حصے میں خواجہ حسن نظامی جب درگاہ حضرت میاں میر صاحب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ نہایت غم گین ہو جاتے ہیں اور ان کا اسلوب افسردہ ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جوں ہی درگاہ حضرت میاں میر صاحب پہنچتے ہیں تو انہیں اپنی بڑی لڑکی حور بانو مرحومہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو کہ چند دنوں پہلے ہی انتقال کر گئی تھیں، جن سے خواجہ حسن نظامی صاحب کی محبت انتہا درجہ تک تھی، مگر وہ پیاری

---

[6] ماخذ سابق، ص۔ ۴

بڑی بیٹی اپنے بزرگ باپ کے دیدار کی خواہش لیے ہوئے اس جہان فانی سے رخصت ہوگئی۔اس بات کا ذکر خود حور بانو نے اپنے باپ خواجہ حسن نظامی کو لکھے خط میں کیا ہے۔خواجہ صاحب لاکھ جتن اور کوشش کے باوجود اپنی چہیتی بیٹی سے وقت آخر میں اس لیے نہیں مل پاتے ہیں کہ وہ پاکستان میں تھے اور حالات خراب ہونے کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب دہلی میں نظر بندی کے ایام گزارنے پر مجبور تھے۔اسی لیے ایام نظر بندی کے بعد جب پاکستان کا یہ سفر ہوتا ہے تو وہ اپنی بیٹی کی قبر پر زار و قطار رونے لگتے ہیں اور آنسو ہیں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔خواجہ حسن صاحب اپنی اس بیٹی کو بہت چاہتے تھے، یہاں تک کہ جب حور بانو صرف پانچ برس کی تھیں تو ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور خواجہ حسن نظامی نے آٹھ برس تک صرف اس لیے نکاح ثانی نہیں کیا کہ وہ سوتیلی ماں کے برتاؤ سے ڈرتے تھے۔خواجہ صاحب نے انھیں کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ بہت اچھی مضمون نگار تھیں۔اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایک دفعہ لیڈی ولنگٹن نے ان (حور بانو) سے پوچھا کیا تم کو پردے میں کچھ تکلیف ہے۔حور بانو نے برجستہ جواب دیا کیا آپ کو بے پردگی میں کچھ آرام ہے[۷]۔

پاکستان کے اس سفر میں خواجہ حسن نظامی نے پاکستان کے مختلف مقامات جیسے لاہور، پاک پٹن، کراچی، اوکاڑہ اور ملتان وغیرہ کے اسفار کئے اور وہاں اپنے متوسلین، متعلقین، معتقدین اور مریدین سے ملاقاتیں کیں جس کا ذکر انہوں نے بڑے تفصیل سے کیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنے اس پہلے سفر میں پورے پاکستان کی سیاحت تو نہیں کی مگر چند اہم شہروں، وہاں کی دعوتوں اور لوگوں کے اخلاص کا ذکر کیا ہے۔البتہ سفر نامے میں قاری جس چیز کی معلومات کا خواہاں زیادہ ہوتا ہے وہ مسافر کے مقام سفر کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن اور اخلاق و عادات وغیرہ ہیں۔ان کا ذکر انہوں نے کم کیا ہے جو کہ سفر نامے کے بنیادی شرائط میں سے ہیں۔کیوں کہ کوئی بھی قاری کسی کا سفر نامہ صرف مسافر کے دعوت اور خاندان اور اعزہ وغیرہ سے ملاقات کی روداد معلوم کرنے کے لیے کیوں پڑھے گا، وہ تو کسی سفر نامہ کی قراءت میں اس وقت دلچسپی لیتا ہے جب اسے نامعلوم سرزمین کی باتوں کا علم اس سفر نامے سے حاصل ہو۔سو اس اعتبار سے خواجہ حسن نظامی کے 'سفر نامۂ پاکستان' کے یہ پہلے سفر کا سفر نامہ قاری کو مایوس کرتا ہے۔ہاں صرف ایک جگہ ہندوستانی

---

[۷] ماخذ سابق، ص۔۹

مہاجرین اور پاکستان کے قدیم باشندوں کے ربط وضبط کے ضمن میں لکھا ہے کہ وہاں کے قدیم باشندوں کی ہمدردی مہاجرین سے بہت کم دیکھنے کو ملی۔ لیکن میں نے مہاجرین کو ثابت قدم پایا۔ وہ لکھتے ہیں:

میں نے پورے پاکستان کو نہیں دیکھا صرف چند شہر دیکھے اور ان شہروں کے دیکھنے سے اور حالات پر غور کرنے سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ پاکستان کے قدیمی مسلمان باشندوں میں قرون اول کے انصار کا سا ایثار نہیں ہے یعنی ان کو مہاجرین سے ہمدردی بہت کم ہے البتہ مہاجرین کو میں نے صابر وثابت قدم پایا[۸]۔

خواجہ حسن نظامی نے جو یہ اخلاق واخلاص کی بات کی ہے وہ ۱۹۵۰ء کی ہے جبکہ ابھی ابھی پاکستان کے وجود میں آئے تین برس ہوئے تھے، لیکن اب کیا حالت ہے اس کا صحیح اندازہ نہیں۔ البتہ پاکستان کے متعلق ایک امید افزا بات انھوں نے یہ کی ہے کہ میں نے وہاں کے قدیم وجدید یعنی انصار ومہاجرین باشندوں کو حکومت کے تئیں وفادار اور اطاعت کیش پایا۔ وہ لکھتے ہیں:

البتہ میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا جب میں نے پاکستان کے قدیم باشندوں اور مہاجرین کو حکومت کا وفادار اور اطاعت شعار پایا اور یہ خدا کی اتنی بڑی نعمت ہے جو صدیوں کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کو میسر آئی ہے۔ ورنہ گذشتہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ سب مسلمان حکومتوں میں رعایا اور بادشاہ میں کبھی ایسا ربط اور اتحاد نہیں ہوا تھا۔ جیسا اب پاکستان میں پایا جاتا ہے[۹]۔

اس سفر نامے میں ایک عنوان ''پاکستان زیر تنقید'' کا قائم کر کے کئی باتیں صاحب سفر نامہ نے کی ہیں۔ دو باتوں یعنی مہاجرین اور پاکستان کے مقامی باشندوں اور پاکستان کے قدیم جدید باشندوں کا حکومت کے تئیں وفاداری، کا ذکر ما قبل میں ہو چکا۔ اب صرف ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ہے وہ یہ کہ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس سفر میں جن لوگوں سے ملاقاتیں کیں ان کی اکثریت مہاجرین کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

پاکستان میں جو لوگ مجھ سے ملے اور جن لوگوں سے میں نے بات چیت کی ان میں اکثر مہاجرین تھے۔ مقامی باشندگان پنجاب و سندھ و سرحد بہت کم ملے سوائے ان کے جو حکومت کے عہدیدار ہیں۔ مگر وہ بھی سب نہیں ملے[۱۰]۔

---

[۸] ماخذ سابق، ص۔۳۶

[۹] ماخذ سابق، ص۔۳۷

[۱۰] ماخذ سابق، ص۔۳۵

اس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ خواجہ حسن نظامی صاحب پاکستان کے عام افراد سے ملنے میں احتیاط کررہے تھے کیوں کہ کچھ دنوں پہلے انھیں دہلی میں نظر بندی کے ایام گزارنے پڑے تھے جس کی وجہ سے وہ اپنی نہایت چہیتی اور عزیز بیٹی حور بانو کے انتقال پر پاک پٹن پاکستان نہ جا سکے تھے، اور دوسرے یہ کہ گرچہ اب پاکستان جانے کی اجازت مل گئی تھی مگر خفیہ طور پر ان پر حکومت ہند کی کڑی نظر تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ اندر سے کچھ ہراسان نظر آتے ہیں اور تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سفر نامے میں جو کچھ آزادی کے ساتھ لکھنا چاہتے تھے وہ کھل کر نہیں لکھ پارہے ہیں۔ اور بات اس سے بھی ثابت ہے کہ انہوں نے اس کا ذکر اس سفر نامے کے شروع میں کیا تھا کہ ’’بعض تحریر حکومت دہلی کی نظر میں قابل اعتراض ہوئی‘‘ اس لیے انھوں نے بعض بہت سی حقیقت بیانی کے اظہار سے احتراز کیا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> مجھے یہ بھی لکھنا ہے کہ کراچی میں ہائی کمیشن ہندوستان نے مجھے اجازت دیدی تھی کہ میں جس سے چاہوں ملوں یہاں تک کے حیدآباد [دکن] والے میر لائق علی صاحب سے بھی مل سکتا ہوں مگر میں ایسا بزدل ثابت ہوا کہ ۔۔۔۔ (ان) سے ملنے کی جرأت نہ کرسکا۔ اگرچہ نفس نے مجھے یہ کہہ کر تسلی دیدی تھی کہ ان لوگوں سے ملنا تجھ کو دہلی میں جاکر تیرے لیے اور تیری درگاہ کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ لیکن یہ میری کم ہمتی تھی[۱۱]۔

اس طرح کی بہت سی عبارتیں اس سفر نامے میں جابجا مل جاتی ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہیں کہ خواجہ حسن نظامی اندر سے بہت خوف زدہ تھے اور کسی سے ملنے جلنے اور ہر جگہ آنے جانے اور سفر کے تمام حالات کو بعینہ لکھنے میں بہت محتاط تھے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ، ڈاکٹر اقبال کے مزار اور جامع مسجد لاہور بھی نہ جاسکے اور نہ جانے کا ملال کرتے ہوئے اپنے آپ کو کوستے رہے۔

پاکستان کے اس پہلے سفر میں خواجہ صاحب کی جن معروف اور قابل ذکر شخصیات سے ملاقات ہوئی وہ حضرات یہ ہیں: نواب خواجہ محمد شفیع صاحب، بھتیجا سید بدر الدین نظامی اور اہل خاندان، ڈاکٹر سر سیتارام (ہائی کمشنر آف انڈیا)، سر ظفر اللہ خاں (وزیر خارجہ پاکستان)، خواجہ شہاب الدین (وزیر داخلہ پاکستان)، غلام محمد وارثی (وزیر خزانہ پاکستان)، دین محمد صاحب (گورنر سندھ)، شوکت تھانوی وغیرہ۔

---

[۱۱] ماخذ سابق، ص۔۳۶

پاکستان کا دوسرا سفر (۴؍نومبر ۱۹۵۰-۲۴؍دسمبر ۱۹۵۰): 'سفر نامۂ پاکستان' میں پاکستان کے دو سفروں کا ذکر ہے۔ پاکستان کے دوسرے سفر نامے والا حصہ فنی اعتبار سے کافی کمزور معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اس میں سفر نامہ نگاری کی اہم خصوصیات جیسے نئی زمین کی تلاش، نئے تہذیب و تمدن سے قاری کو آگہی کی ترسیل، نامعلوم زبان اور تعلیم کی واقفیت یا اس کی دریافت اور وہاں کی آب و ہوا اور رہن سہن کے مفصل یا مجمل ذکر کا فقدان نظر آتا ہے۔

اس سفر کا آغاز ۴؍ نومبر ۱۹۵۰ء کو بیوی بچوں کے ساتھ بذریعہ ریل ہوا اور ۲۴؍ دسمبر ۱۹۵۰ء کو واپسی بھی لاہور اور امرتسر ہوتے ہوئے دہلی تک بذریعہ ریل ہی ہوئی۔ کل پچاس دن کے اس سفر میں خواجہ حسن نظامی نے پاکستان کے بہت سے شہروں میں قیام کیا اور کثیر تعداد میں لوگوں سے ملاقاتیں کیں، جن میں عمائدین، متوسلین، متعلقین، اہل خاندان، اعزا و محبین اور دیرینہ احباب، سیاست داں، اہل ادب اور اہل تصوف وغیرہ شامل ہیں۔ خاص ملاقاتیوں میں سید رشید احمد بخاری (فرزند شمس العلما مولانا سید احمد بخاری صاحب مرحوم، امام جامع مسجد دہلی)، شوکت تھانوی، سید امتیاز علی تاج، سید احمد علی، ملا واحدی، نیازی صاحب (ایڈیٹر رسالہ نقاد)، حکیم حافظ محمد سعید صاحب (مالک دواخانہ ہمدرد)، ڈاکٹر سیتا رام صاحب (انڈین ہائی کمشنر)، امریکی سفیر، مشتاق احمد وجدی (اکبر الہ آبادی کے نواسے)، خواجہ شہاب الدین (وزیر داخلہ پاکستان)، حاجی وجیہہ الدین، سید الطاف حسین، قمر السلام صاحب، حاجی حبیب الرحمن، عثمان صاحب آزاد (ایڈیٹر روزنامہ اخبار انجام دہلی۔ مقیم حال پاکستان)، عبدالمنعم صاحب (ایڈیٹر 'العرب' عربی اخبار)، چوہدری نذیر احمد صاحب (وزیر صنعت و حرفت پاکستان)، سفیر شام، سفیر حجاز، ڈپٹی سید عزیزالدین صاحب (خواجہ حسن نظامی کی لڑکی روح بانو کے خسر)، رشید حسین (سر سید کے نواسے)، سید مسلم (اکبر الہ آبادی کے پوتے)، مولانا عبدالحامد بدایونی، محمد حنیف نظامی، سید وصی اشرف دہلوی (تاجر کتب)، غلام احمد نظامی، حاجی محمود صاحب خادم، مسٹر ایس۔ ایم رشید (ڈپٹی کمشنر، ملتان)، پروفیسر چاند میاں نظامی (مصنف: بولتا قاعدہ) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہ سفر نامہ دراصل سفر نامہ کی ہئیت یا فن کے لوازمات پر پورا نہیں اترتا، البتہ روزنامچے کی ہئیت اور تقاضے کو پورا کرتا ہے، اسی لیے اگر اس سفر نامے کو سفر کا روزنامچہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس میں تاریخ وار اور مقام بمقام باتیں کی گئی ہیں۔ بیان میں تاریخ کی ترتیب کا لحاظ تو بہت اچھا ہے بلکہ کس مقام پر کب گئے اور کن اشخاص سے ملاقات کی اس کی تفصیل بالکل سلسلہ وار ہے۔ اسی طرح ملاقاتیوں کے تعارف کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی جس سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ شخص جتنا خواجہ صاحب کا قریبی ہے اس

کا ذکر بھی ٹھیک اسی انداز میں اور شایان شان کیا گیا ہے مثلاً:

نیازی صاحب۔ پاکستان کے مشہور و مقبول رسالہ 'نقاد' کے ایڈیٹر ہیں، دہلی میں "کامیاب" رسالہ شائع کرتے تھے اور زنانہ دواخانہ بھی جاری کیا تھا۔ کراچی میں بھی زنانہ دواخانہ جاری ہے۔ سالہا سال تک میری رفاقت کا کام کر چکے ہیں یعنی میرے دفتر کا بھی کام کرتے تھے اور میرے مضامین کے املا نویس بھی تھے۔۔۔ ان کا رسالہ 'نقاد' چالیس ہزار سے زیادہ چھپتا ہے۔ میں ان کا دفتر اور دواخانہ بھی دیکھنے گیا تھا۔[۱۲]

دوسرا اقتباس: "راشد حسین۔ سر سید مرحوم کے نواسے راشد حسین اور ان کی والدہ اور خالہ اور ماموں انقلاب ۱۹۴۷ء کے وقت میرے گھر میں تھے۔ اور جب میں حیدر آباد چلا گیا تو وہ سب کراچی آ گئے۔ پہلے سفر کے وقت بھی وہ سب ملنے آئے تھے اور اب دوسرے سفر میں بھی روزانہ وہ اور ان کی عورتیں آتی رہتی ہیں۔"[۱۳]

اس پورے سفر نامے میں ملاقاتیوں کا ذکر حسب تعلق اسی طرح کیا گیا ہے۔ پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ گویا یہ ایک ذاتی ملاقاتیوں کا تعارف ہے۔ وہاں کے خورد و نوش، طرز زندگی، آب و ہوا، طرز معاشرت اور عادات و اطوار کا بیان کہیں نہیں ملے گا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ چونکہ ہند و پاک دونوں ماضی قریب میں ایک ہی ملک تھے اسی وجہ سے تقریباً دونوں کے تہذیب و تمدن، معاملات اور زبان و ادب اور ثقافت و کلچر میں کچھ زیادہ فرق نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے ان پر روشنی نہیں ڈالی ہو، مگر یہ بھی حقیقت کے برعکس ہے، کیوں کہ جن علاقوں میں اس سفر کے دوران خواجہ صاحب کا قیام ہوا جیسے سندھ، لاہور، کراچی اور اوکاڑا وغیرہ ان سب کی اپنی اپنی ایک تاریخ، تہذیب اور کلچر ہے یہاں تک کہ سندھی زبان و ادب بھی شمالی ہندوستان کے ادب و کلچر سے الگ ہے۔ اور سفر نامہ نگاری کا تقاضہ یہ ہے کہ سفر نامہ نگار ایک تو خود مسافر ہو اور سفر نامہ کی روداد کا چشم دید شاہد ہو اور پھر سفر میں جو حالات و واقعات پیش آئیں انھیں، اور جس طرح تہذیب و تمدن سے آشنائی ہو اور اس سفر سے جو تجربات حاصل ہوں انھیں اپنے مشاہدات کی روشنی میں ادبی اسلوب کے ذریعے اس طرح بیان کرے کہ سفر نامہ کے قاری کو نئی دریافت کا ذخیرہ معلوم ہو۔ اس اعتبار سے یہ سفر نامہ میزان سفر نامہ نگاری پر کافی ہلکا

---

[۱۲] ماخذ سابق، ص۔ ۶۵

[۱۳] ماخذ سابق، ص۔ ۴۷

لگتا ہے۔ البتہ خواجہ حسن نظامی ہی کے ماقبل کے دو سفر نامے 'سفر نامہ مصر وشام و فلسطین و حجاز' اور 'سفر نامہ افغانستان' کو ناقدین نے بہت سراہا ہے، جس کا تجزیاتی مطالعہ میرے اس مقالے میں شامل نہیں ہے۔

اس سفر نامے میں دو تین جگہوں پر خواجہ حسن نظامی نے اپنے اسلوب اور انشائی انداز بیان کا ہنر دیکھایا ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا کوئی انشاپرداز اپنے مشاہدات کو اپنی ذہنی اپج کے ساتھ طرز انشاپردازی میں گفتگو کر رہا ہے۔ گورنر جنرل پنجاب کی ڈنر پارٹی کے ذکر کے اس انشائی انداز کا ایک اقتباس بطور مثال پیش ہے:

> اس بڑے کمرے کے قریب ایک چھوٹا کمرہ بھی تھا۔ جو خالی تھا اور وہاں آتش دانوں میں آگ جل رہی تھی اس لیے میں دعوت طعام کے میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگا اور خالی کمرے میں آگ کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اور شعلے کھیل رہے تھے۔ میں نے اپنے جنون دماغی کے موافق ان شعلوں سے کہنا شروع کیا: ''تم قال ہو۔ تم حال ہو۔ تم نور ہو۔ تم نار ہو۔ تم آتش پرستوں کے قبلہ ہو۔ اور مجھ سردی میں اکڑنے والے کے لیے یار ہم آغوش ہو۔ میں بھی خود فراموش ہوں۔ اور تم بھی خود فراموش ہو۔ میں بھی اپنے اندر بھڑکتی آگ دیکھ رہا ہوں اور تم بھی بھڑکتی آگ کی موجیں ہو۔'' یہ مجذوبانہ باتیں چپکے چپکے کر رہا تھا[۱۴]۔

جو انداز بیان مذکورہ بالا اقتباس میں ملاحظہ کیا گیا در اصل اسی انداز بیان اور طرز ادا کے لیے خواجہ حسن نظامی اردو کے ادبی دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔ ایک معمولی سی بات اور واقعہ میں بھی ادب اور اس سے حاصل ہونے والے اپنے انداز کے اسباق و پیغامات کو وہ اس طرح پردۂ خفا سے باہر لاتے ہیں کہ قاری حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ خواجہ حسن نظامی کا ذہن رسا کہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ ایک عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس پورے سفر نامے کو پڑھنے کے بعد خواجہ حسن نظامی کی وہ شخصیت بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہے جس کے لیے وہ جانے جاتے ہیں، یعنی ان کا وسیع المشرب ہونا۔ خواجہ حسن نظامی نہ صرف ایک اچھے ادیب وانشاپرداز تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ در گزر کرنا، مشکل حالات کا صبر و تحمل کے ساتھ مقابلہ کرنا اور مسلکی و مذہبی تنافر سے اجتناب ان کا خاص وصف تھا۔ بعض مرتبہ تو اپنی انھیں خوبیوں کی

---

[۱۴] ماخذ سابق، ص۔۹۱

وجہ سے عوام کے لعن وطعن اور علما کے کفر کے فتوے کا سامنا بھی کرنا پڑا، مگر خواجہ حسن نظامی نے اپنی ان خوبیوں سے ذرہ برابر بھی رو گردانی نہیں کی۔ وہ دراصل وسیع المشرب صوفیوں کے سچے جانشین تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے دنیا کے متعدد ممالک اور مقدس مقامات کی سیر کی۔ ان مقدس مقامات میں صرف اسلامی مقامات نہیں ہیں بلکہ گرودوارے، گرجے، مندر اور مٹھ سبھی شامل ہیں۔ اور حسب حال اور حسب ضرورت وقت کے تقاضے کے مطابق اپنی شباہت اور کپڑے بھی بدلے یہاں تک کے بال بڑھائے، گیروے کپڑے زیب تن کیے اور ہاتھ میں کمنڈل اور بغل میں کمبل لے کر نگری نگری گھومتے پھرے، جس کی وجہ سے انھیں بعض طبقات کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جب ہند و پاک کے مسلمانوں میں ایک طرف تقسیم ہند کی بے چینی اور افراتفری تھی اور دوسری طرف مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کے فتنے کی شورش اپنے عروج پر تھی اس وقت بھی عقائد اور مسلکی اختلاف کے باوجود قادیانیوں کے جلسے کی صدارت قبول بھی کرتے اور انجام و مخالفت کی پرواہ کیے بغیر شرکت بھی کرتے تھے۔ قادیانیوں کے عقائد کے خلاف مسلمانان ہند و پاک کے اندر بہت بے چینی اور غصہ تھا۔ اس لیے خواجہ حسن نظامی کا قادیانیوں کے جلسے میں شرکت سے لوگ ان کے اتنے مخالف ہو گئے کہ بعض دفعہ ان پر حملے بھی ہوئے۔ اپنے اسی سفر نامے میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دہلی میں قادیانی جماعت کے لوگ جب سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جلسہ کرتے تھے تو مجھے صدر بناتے تھے اور اس سلسلے میں مجھ پر حملے بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ جامع مسجد دہلی کے سامنے پریڈ کے میدان میں جلسہ ہوا اور میں نے صدارت کی اور جمعیت علماء کے لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا۔۔۔ میرا اگلا گھونٹا، داڑھی کھینچی، چہرے پر تھوکا۔ اس وقت میری موٹر میں ممبئی کے گجراتی اخبار "بے گھڑی موج" کی ایڈیٹر بھی تھے تھی۔۔۔ تھوڑی دیر میں پولیس آگئی اور اس نے مجھ سے پوچھا کن لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ میں نے کہا کسی نے حملہ نہیں کیا۔ میں پولیس کی امداد نہیں چاہتا تھا۔ مفتی شوکت فہمی صاحب پولیس کو لائے تھے۔ انہوں نے کہا: آپ ایسی درگذر کریں گے تو ہمیں پبلک کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے جواب دیا: قرآن ارشاد فرماتا ہے کہ "مومن وہ ہے جو غصے کو پی جائے اور لوگوں کی خطاؤں کو معاف کر دے"۔
>
> کراچی میں قادیانی جماعت نے سیرت کا جلسہ کرانا چاہا تو مجھے صدارت کے لیے بلایا۔ میرے مریدوں نے کہا یہاں عوام کی فضا خراب ہے صدارت مناسب نہیں ہے۔ میں نے کہا رسول

خدا (ﷺ) کا ذکر جو بھی کرے گا۔ میں وہاں سننے کے لیے جاؤں گا۔ چنانچہ میں وہاں گیا۔ صدارت کی[۱۵]۔

خواجہ حسن نظامی کو سیر و سیاحت کرنے اور سفر کے حالات لکھنے، روزنامچہ لکھنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے اکثر سفر نامے روزنامچے کی شکل میں پہلے ان کے رسالہ 'منادی' میں شائع ہوتے بعد میں 'سفر نامہ' کے مختلف ناموں سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

خواجہ حسن نظامی نے جن مشہور ممالک و مقامات کے اسفار کیے وہ یہ ہیں: ۱۹۱۱ء میں ممالک اسلامیہ جیسے مصر، شام، حجاز، اسکندریہ، فلسطین وغیرہ۔ ۱۹۰۸ء میں ممبئی، گجرات، کاٹھیاوار وغیرہ، ۱۹۳۱ء میں افغانستان اور اس کے اہم مقامات جیسے کابل، قندھار، ہرات، بلخ وچشت وغیرہ۔ ۱۹۳۵ء میں برما اور اس کے مختلف مقامات اور آخر میں تقسیم ہند کے بعد ۱۶؍ مئی ۱۹۵۰ء تا ۲۵؍ دسمبر ۱۹۵۰ء دو مرتبہ پاکستان کے متعدد مقامات کا سفر کیا۔ ان اسفار میں انہوں نے جن مقدس مقامات کی زیارت کی ان میں مکہ، مدینہ، دمشق میں مختلف اصحاب کے قبور، مسجد دمشق، ترکی میں مختلف مقدس مزارات و مساجد، فلسطین میں انبیا و اولیا کے مزارات اور تبرکات و بیت المقدس، سمرقند و بخارا کے اولیائے کبار کے تبرکات و مزارات، پاکستان و ہند کے متعدد ہندو و مسلم مقدس مقامات وغیرہ جیسے بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت داتا گنج بخش لاہوری، مندر سومنات، متھرا اور مختلف تیرتھ یاترائیں وغیرہ شامل ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا کہ وہ اپنے ان سفر ناموں کو پہلے روزنامچوں کی صورت میں لکھتے رہے (اسی وجہ سے ان سفر ناموں میں روزنامچوں جیسی کیفیت پائی جاتی ہے) پھر انھیں سفر ناموں کو مختلف نام سے مختلف اوقات میں شائع کیا گیا۔ جن میں سفر نامہ مصر و شام و حجاز، سفر نامہ افغانستان اور ہندوستان کا سفر نامہ، کافی مشہور ہوئے۔

'سفر نامہ مصر و شام و حجاز' میں ۱۹۱۱ء کے اسفار ممالک اسلامیہ جیسے قاہرہ، اسکندریہ، دمشق و فلسطین اور حجاز مقدس کے اسفار کی تفصیل ہے۔ 'سفر نامہ افغانستان' میں ۱۹۳۱ء میں نادر شاہ کے بلانے پر افغانستان کے سفر کے مختلف مقامات، سمرقند و بخارا اور کابل اور معروف ہستیوں سے ملاقات کا تفصیلی ذکر ہے۔ 'ہندوستان کا سفر نامہ' میں ممبئی، کاٹھیاوار، ریاست بڑودہ، تیرتھ یاترا اور مندر سومنات کے اسفار کا دلچسپ بیان ہے اور 'سفر نامۂ پاکستان' میں پاکستان کے مختلف مقامات کے اسفار اور ملنے

---

[۱۵] ماخذ سابق، ص۔ ۶۷۔ ۶۶

والے اشخاص کا ذکر ہے، جو کہ اس مقالے کا موضوع بھی ہے اور ماقبل میں اس پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۹ء

۲۔ خواجہ حسن نظامی، سفر نامۂ پاکستان، دفتر خواجہ حسن نظامی، دہلی، ۱۹۵۲ء

۳۔ علامہ شبلی نعمانی، سفر نامۂ روم و مصر و شام، مفید عام پریس، آگرہ، ۱۸۹۴ء

ملی مسائل

مسلم لڑکیوں کے غیر مسلم لڑکوں سے شادی کے واقعات

(دینی تنظیموں کے سربراہان کی جانب سے رہ نما ہدایات)

حالیہ دنوں میں مسلم لڑکیوں کے غیر مسلم لڑکوں سے شادی کے واقعات پر ملک کے مسلمانوں میں خاصی بے چینی محسوس ہو رہی ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

۱۔ اس مسئلے کا ایک پہلو یہ ہے کہ ایسے واقعات جگہ جگہ پیش آ رہے ہیں، جس پر بجا طور پر مسلمانوں کے اندر تشویش اور بے چینی پائی جاتی ہے اور دوسرا پہلو یہ بھی ہے اور اس کے شواہد بھی موجود ہیں کہ مسلم لڑکیوں کی غیر مسلم لڑکوں سے شادیوں کی ہمت افزائی اور اس طرح کے حقیقی اور غیر حقیقی واقعات کی تشہیر کی منظّم کوشش بھی ہو رہی ہے۔ اس کا مقصد امت مسلمہ کے حوصلوں کو پست کرنا، ان کے اندر خوف، اضطراب اور احساس شکست کو فروغ دینا اور مسلم لڑکیوں کو تعلیم سے دور کرنا ہو سکتا ہے۔ ان واقعات میں کوئی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے یا نہیں؟ اس کا پتہ لگانے کے لیے ٹھوس اسٹڈی اور اعداد و شمار دست یاب نہیں ہیں۔ برائیوں کی تشہیر اور ان کا بار بار تذکرہ عام لوگوں کے اندر ان کی شناعت کے احساس کو کم کر دیتا ہے۔ اس لیے ان واقعات کی روک تھام کی سنجیدہ کوشش ضرور ہونی چاہیے، لیکن ان کی تشہیر، ان کے بہ تکرار تذکرے اور ان کے سلسلے میں مبالغے سے گریز کرنا چاہیے۔

۲۔ ایسے واقعات کی وجہ سے تمام مسلمان لڑکیوں کے سلسلے میں بے اعتمادی کا اظہار، یا ان کی تعلیم کی مخالفت نامناسب رجحانات ہیں۔ بین مذہبی شادیوں کے واقعات جہاں تعلیمی اداروں اور کام کی جگہوں میں پیش آ رہے ہیں وہیں رہائشی علاقوں اور بستیوں سے بھی ان کی رپورٹیں آ رہی ہیں۔ اس لیے لڑکیوں کو تعلیم سے روکنا اس کا حل نہیں ہے، بلکہ معاشرے میں صحیح دینی بیداری لانا اس کا حل ہے۔

۳۔ غیر مسلم سے شادی ناجائز اور گناہ کا کام ہے، لیکن محض اس طرح کی شادی سے یا کسی بھی گناہ کے کام سے کوئی مرتد نہیں ہو جاتا۔ جب تک اسلامی عقیدے سے دست برداری کا واضح اعلان نہ ہو، یا ایسے اعمال کے ارتکاب کے شواہد نہ ہوں جو ارتداد کی علامات مانے جاتے ہوں، اس وقت تک کسی کو مرتد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے محض شادی پر کسی کو مرتد قرار دے دینا یا ایسی شادیوں کے واقعات کا عنوان ہی ''مسلم لڑکیوں کا ارتداد'' رکھ دینا نامناسب بات ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ ارتداد کے شواہد نہ ہوں تو ایسی شادیاں کرنے والی لڑکیوں کو مسلمان ہی سمجھنا چاہیے اور مسلمان سمجھ کر ہی ان کی اصلاح کی کوشش کی جانی چاہیے۔

۴۔ کچی عمر میں کسی لڑکے یا لڑکی سے ایسی غلطی ہو جائے تو وہ ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔ جو لڑکے اور لڑکیاں ایسی غلطی کر بیٹھیں اور پھر اس دلدل سے نکلنا چاہیں، ان کا تعاون کرنا چاہیے اور ان کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ماں باپ کو اپنا دل بڑا کرنا چاہیے۔ اگر ان کی کوئی لڑکی ایسے کام میں ملوث ہو گئی ہو اور کچھ عرصہ کے بعد اس کو شرمندگی کا احساس ہو اور وہ رجوع کرنا چاہے تو اس کو اس کا موقع فراہم کیا جانا چاہیے۔ مسلم معاشرے کو بھی ایسی لڑکیوں کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے اور رجوع کرنے والی لڑکیوں کا کھلے دل کے ساتھ معاشرے میں استقبال کیا جانا چاہیے۔

۵۔ یہ اصلاً ایک سماجی اور اخلاقی مسئلہ ہے۔ دین سے ناواقفیت اور دینی تربیت کی کمی، مخلوط تعلیم اور عفت و حیا کے تصورات کا کمزور پڑ جانا، مسلم معاشرے میں شادی کی بے جا رسوم اور اس کے نتیجے میں نکاح کا مشکل ہو جانا اور تہذیبی گراوٹ اور خود اعتمادی میں کمی وغیرہ اس کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ ان اسباب پر سنجیدہ توجہ اور ان کے علاج کی ضرورت ہے۔ مسلمان لڑکے کی غیر مسلم خاتون سے شادی، یا مسلمان خاتون کی غیر مسلم مرد سے شادی، یا شادی کے بغیر تعلق، یہ سب اسلام میں سخت ممنوع اور گناہ کے کام ہیں۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ ان گناہوں کی شناعت کا احساس پیدا کیا جائے۔ عفت و عصمت اور حیا و پاکیزگی کے ماحول کو فروغ دیا جائے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے آزادانہ میل جول اور شرعی حدود کی پامالی کو روکا جائے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی دینی تعلیم و تربیت پر توجہ دی جائے۔ اس کے لیے درج ذیل تدابیر ہم تجویز کرتے ہیں:

الف) غیر مسلم لڑکوں اور لڑکیوں سے شادیوں کے حرام ہونے پر جمعہ میں خطبات کا اہتمام کیا جائے اسی طرح عفت و حیا، نامحرم مردوں اور عورتوں کے میل جول کے اسلامی آداب، اور اسلام کی جنسی اخلاقیات کو خطبات کا موضوع بنایا جائے۔

ب) لڑکیوں کی دینی تعلیم و تربیت کی خصوصی مہمیں چلائی جائیں۔ ان کے لیے جز وقتی دینی تعلیم کے کورسوں کا اہتمام ہو۔ قرآن فہمی کی کلاسوں کا اہتمام ہو۔

ج) مسلم والدین کے اندر لڑکوں اور لڑکیوں کی درست دینی تربیت کے سلسلے میں بیداری لانے اور اس کی تدابیر بتانے کا مسلسل اہتمام ہو۔ ان موضوعات پر والدین کے خصوصی پروگرام کیے جائیں۔

د) خواتین اور لڑکیوں کو دینی تعلیم و تربیت اور دینی ماحول سے استفادے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ اب جب کہ لڑکیاں مختلف میدانوں میں آگے بڑھ رہی ہیں، یہ زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ انہیں اسی مناسبت سے دینی ماحول میسر آئے۔ تعلیمی اداروں اور کام کی جگہوں پر تربیت کا نظم ہو۔ مختلف دینی و اصلاحی تحریکیں

خواتین اور لڑکیوں کو بھی اپنا مخاطب بنائیں اور اپنے کاموں میں انہیں شامل کریں۔

ہ) کم از کم بازاروں، تعلیمی اداروں، شاپنگ مالوں، دفاتر اور کمپنیوں، وغیرہ کے قریب واقع مساجد میں خواتین کے لیے نماز کی جگہ فراہم کرنے کی کوشش کی جائے۔

و) ایسے کاؤنسلنگ سینٹرز بنائے جائیں جہاں ناجائز تعلقات میں مبتلا لڑکوں اور لڑکیوں کی مناسب کاؤنسلنگ کی جاسکے اور انہیں اس دلدل سے باہر نکلنے میں مدد کی جاسکے۔

۶۔ اس مسئلے کا ایک اہم ترین حل یہ بھی ہے کہ مسلم معاشرے میں نکاح کو آسان بنایا جائے۔ شادی کی عمر کے بعد جلد سے جلد نکاح ہو سکے، اس کی فضا کو عام کیا جائے اور نکاح کو مشکل بنانے والے تمام عوامل کے خلاف ملک گیر سطح پر طاقت ور تحریک چلائی جائے۔ یہ تحریک بہت سے لوگ برسوں سے چلا رہے ہیں، لیکن اب وقت آگیا ہے کہ پوری ملت اس تحریک کو اپنی ایک اہم ترجیح بنائے۔

۷۔ اس مسئلے کو بار بار تذکرے میں لا کر امت کے اندر کم زوری اور شکست خوردگی کے احساس کو تقویت دینے کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے مصلحین، مقررین، مصنفین اور دینی و سماجی تحریکیں مذکورہ بالا نکات پر توجہ دیں اور ان حوالوں سے اپنی کوششوں کو تیز تر کریں

دستخط کنندگان: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، صدر، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ؛ جناب سید سعادت اللہ حسینی، امیر، جماعت اسلامی ہند؛ مولانا سید محمود اسعد مدنی، صدر، جمعیۃ علماء ہند؛ مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی، امیر، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند؛ احمد ولی رحمانی صاحب، امیر شریعت، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ؛ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، سابق صدر، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت؛ مولانا یٰسین علی عثمانی، نائب صدر، آل انڈیا ملی کونسل؛ پیر تنویر ہاشمی صاحب، صدر، جماعت اہل سنت، کرناٹک؛ ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس، ترجمان، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ؛ جناب مقبول احمد سراج، بنگلور؛ مولانا شبیر احمد ندوی، بنگلور؛ جناب عبد السلام پتھیگے، منگلور؛ جناب کمال فاروقی، معاون ترجمان، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

(**جاری کردہ:** نیاز احمد فاروقی، سکریٹری جمعیۃ علماء ہند؛ ملک معتصم خان (نائب امیر، جماعت اسلامی ہند۔ ۱۱ جون ۲۰۲۳)

اخبار علمیہ

توت عنخ آمون کی ۱۵۰ لاٹھیوں کے ساتھ تدفین

قدیم فراعنہ مصر میں عنخ آمون کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کمزور اور ایک پیر سے معذور تھا۔ مختلف شکلوں اور ڈیزائن کی تقریباً ۱۳۰ لاٹھیوں کے ساتھ اس کو دفن کیا گیا جن کو وہ اپنے چلنے میں مدد کے لیے استعمال کرتا تھا۔ لیکن مصر کی قدیم تاریخ کے بعض ماہرین نے انکشاف کیا کہ یہ مفروضہ غلط ہو سکتا ہے۔ برطانوی جریدہ ''ڈیلی میل'' میں شائع ایک رپورٹ کے مطابق وہ ایک تجربہ کار اور ماہر جنگجو بادشاہ تھا، کمزور اور مریض نہیں تھا۔ بایو میڈیسن کی ایک ماہر صوفیہ عزیز کہتی ہیں کہ جب میں نے عنخ آمون کو پڑھا اور اس کی حیات اور کارناموں کا مطالعہ کیا تو ذاتی طور پر میں یہ سمجھ نہیں پارہی ہوں کہ اس کے معذور ہونے کی کوئی دلیل موجود ہو۔ اس لیے کہ میں نے ایسی ممیاں دیکھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پیر سے معذور ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ پیتھالوجیکل تبدیلیاں غلط ہیں جو اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ لاٹھیاں محض بادشاہوں کی علامت کے طور پر تھیں۔ انہوں نے مزید واضح کیا کہ پاؤں کا ٹیڑھا یا ایک طرف جھکا ہونا عمل حنوط کے دوران ہوا ہوگا کیونکہ گوند لگانے اور پٹیاں باندھنے سے شکل بگڑ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے محارب ہونے کے اور بھی دلائل ہیں۔ انہوں نے اس جانب بھی اشارہ کیا کہ اس کے بائیں پاؤں کی دوسری انگلی بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے سینڈ بکس میں منتقل کرنے کے بعد یہ کھو گئی ہو یا کسی شخص نے بطور یادگار اس کو رکھ لیا ہو (صحیفۃ الوطن، بحرین، ۴ جون ۲۰۲۳ء ص ۲۰)

ایک بلب جو ۱۲۲ برس سے روشن ہے

صد سالہ بلب دنیا کے نقشہ پر پہلا بلب ہے جو ۱۹۰۱ء سے مسلسل روشنی دے رہا ہے۔ اس بلب کو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اس لیے درج کیا گیا ہے کہ یہ اس روئے زمین پر سب سے قدیم بلب ہے جو اب تک روشن ہے۔ اس کو شیلبی الکٹرانک (Shelby Electronic) کمپنی نے تیار کیا تھا۔ یہ صرف چار واٹ کا ہے۔ یہ امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر لیور مور (Livermore) کے فائر اسٹیشن میں موجود ہے۔ (صحیفۃ الوطن، بحرین ۱۷ جون ۲۰۲۳ء ص ۱۶)

ک، ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

رسائل کے خاص نمبر:

جرنل ۷ (اسلامی علوم وفنون کی داستان پارینہ) مرتب: پروفیسر محی الدین بمبئی والا، قیمت ۴۰۰ روپے، پتہ: حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، حضرت پیر محمد شاہ روڈ، پانکور ناکہ، احمد آباد، گجرات۔ فون: ۲۵۳۵۱۷۷۲۰۲۔ سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء

گجرات کا احمد آباد اپنے ثقافتی، تہذیبی، علمی اور مذہبی آثار وباقیات کی وجہ سے ان اسلامی شہروں میں ممتاز ونمایاں ہے، جن کا وجود اندلس سے انڈونیشیا تک بجائے خود وہ تاریخی وثیقہ ہے جس پر تاریخ ہمیشہ نازاں رہے گی، اسی احمد آباد کے آثار میں ایک درگاہ پیر محمد شاہ بھی ہے جس کے نام اور جس کے علمی و ثقافتی مقام سے شاید ہی کوئی صاحب علم بے خبر ہو۔ یہ عجیب درگاہ ہے جہاں مزاروں اور قبروں سے زیادہ مخطوطات اور اہم مطبوعات کی موجودگی ایک جدا علمی تقدس و تبرک کا احساس دلاتی ہے۔ جس کا ایک اثر وہاں سے شایع ہونے والے جرنل کی شکل میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ جرنل نمبر ۷ ہے، سابقہ شماروں کی طرح اس کے مرتب فاضل محقق پروفیسر محی الدین بمبئی والا ہیں، جنہوں نے پیش لفظ میں کورونا اور پھر لاک ڈاؤن کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ وبا محض وبا نہیں تھی، اس بلا نے انسان کا وہ اعتماد ہی برباد کر دیا جو زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ بے یقینی، ناآگہی اور مسخ و مردہ ہوتی باہمی شناخت اس وبا سے پہلے کسی اور آفت کا نتیجہ نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں اردو رسائل و کتب بھی اس وبا کا اس طرح شکار ہوئے کہ قریب نصف سے زائد تعداد کا اب وجود نہیں رہا، گذشتہ دو برسوں میں بعض رسائل نے حیات نو پانے کی کوشش ضرور کی ہے۔ ان میں زیر نظر جرنل بھی ہے۔ جو گو رسالہ ہے لیکن اس سے زیادہ چند بہترین اور منتخب تحریروں کی وجہ سے مکمل کتاب بھی ہے۔ اس کے سولہ مضامین میں چھ صرف تاریخ ہند کے تعلق سے ہیں اور یہ مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ اکرام، علامہ ثقۃ الاسلام، اقتدار عالم خاں، شبیر غوری اور شاہد کمال جیسے باکمال اہل قلم کے نوشتے ہیں، باقی پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر مفتی محمد اقبال ٹنکاروی کے مقالات، تفسیر و تصوف اور فتویٰ نویسی کے موضوعات پر ہیں، مولانا عبدالسلام ندوی نے فلسفہ اشراق، فیلالوجی اور مطابع اور مسلمان جیسے عنوانوں سے نہایت عالمانہ مضامین لکھے تھے۔ ان کو بھی اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ایک اور بہت مفید مضمون جس کا ذکر محققین سیرت کے ہاں ملتا ہے اور جو الفریڈ گیوم کے قلم سے ابن اسحاق

اور سیرت رسول اللہ ﷺ کے عنوان سے ہے۔اس کا ترجمہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے کیا تھا، وہ بھی اس جرنل میں شامل ہے اور یقیناً اس سے اس خاص شمارہ کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ مفتی اقبال ٹنکاروی کا مضمون بھی ترجمہ ہے اور حامد علی خاں کے قلم سے ہے۔ سترہویں اور اٹھارہویں میں گجرات کے مفتیان کرام کا یہ تذکرہ بڑی محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے گجرات کے کتب خانوں سے اور استفادہ کیا جاسکتا تھا، لیکن بجا طور پر کہا گیا کہ اب نہ تو ان عمارتوں کا پتہ ہے اور نہ ان میں محفوظ ہزاروں مخطوطات کا کوئی علم ہے۔ جرنل میں ایک حصہ تصویروں کا ہے اور چند انگریزی مقالات بھی ہیں، فریزر روز نتھال کا ایک مضمون بیرونی، یونان وہند کے درمیان کے عنوان سے ہے، براس بی. لارنس اور جی ایس یوسفی کی تحریریں بھی البیرونی پر ہیں، اسی حصہ میں فن خطاطی کے تعلق سے کئی شاہکار نمونے بھی دیے گئے ہیں۔ علمی و تاریخی اور مذہبی موضوعات کا بلند ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ جرنل بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ طباعتی غلطیوں کا ذکر اب اچھا نہیں لگتا، خاص طور پر جب معارف کو المعارف کہہ کر یاد کیا جائے۔

دستک: شمارہ:۹ معاصر ناول نمبر مدیر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، قیمت: ۳۰۰ روپے، پتہ: شعبۂ اردو فیکلٹی آف آرٹس، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، موبائل: ۹۴۵۰۵۲۷۷۳۳ ۔ ای میل: dastakurdubhu@gmail.com

اردو دنیا کی گذشتہ تین نسلوں کے مطالعہ میں ایک حصہ ناولوں کا ضرور شامل رہا، تاریخی، سماجی، رومانی اور جاسوسی ناولوں نے اردو قاری سے مسلسل ایک مضبوط رشتہ استوار رکھا۔ اسی کے ساتھ فنی اور معنوی لحاظ سے بھی ناول نگاری پر وقت کے سایے کبھی گہرے اور کبھی ہلکے نظر آتے رہے۔ خدا کی بستی اور اداس نسلیں وغیرہ شاید اردو کی تیسری ناول خواں نسل کی یادوں میں اب بھی تازہ ہوں۔ لیکن پھر قریب سوا صدی کی اس ناولانہ روایت کا رنگ اڑنے لگا، اردو کا قاری پہلے تو کم ہوا اور پھر کہیں گم ہوگیا۔ کہانی، افسانہ، مختصر افسانہ اور ناول، یہ سب جدید بازار یا صارفیت کے زیر اثر بھولے بسرے قصوں میں بدل گئے اور زبانوں کا علم نہیں لیکن اردو میں عموماً یہ محسوس کیا گیا کہ جدیدیت یا مابعد جدیدیت یا پھر ہر دس سال بعد کی بدلتی جدیدیت کے زیر اثر کچھ ناول لکھے بھی گئے تو وہ عام قاری کے لیے نہیں، صرف ایسا لگا کہ یہ مخصوص نظریاتی نقادوں کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اس ناول نگاری کی پہچان کے لیے بامعنی لفظ معاصر ہی ہے۔ ہندو یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے ادھر کئی برسوں سے اپنے مجلہ دستک کے ذریعہ بہت اہم لیکن تغافل کے شکار چند موضوعات کے بند اور تاریک دروں پر دستک دی،

ان کوششوں میں زیر نظر مجلہ بھی شامل ہے۔ جس میں معاصر زمانہ کا تعین ۱۹۸۰ء سے کیا گیا، گویا قریب نصف صدی کی ناول نگاری، عصری عہد کی ترجمان قرار دی گئی۔ اس میں ''دھنورا، مہارماری، روحزن، خواب سراب، تلک الایام، لے سانس بھی آہستہ، تخم خوں'' جیسے ناولوں کا تجزیہ ہے۔ ایک اور ناول اللہ میاں کا کارخانہ پر شافع قدوائی کا عمدہ تبصرہ ہے۔ اس ناول کا ذکر چند دنوں پہلے اخبارات میں اس لیے نمایاں طور پر ہوا کہ اس کے ناول نگار پر انعامات کی گویا بارش ہوگئی۔ ناول نگار محسن خاں سے اردو والوں کو اگر قرۃ العین حیدر نہیں تو خدیجہ مستور والی واقفیت ہونی چاہیے۔ شروع میں ناول کے فن کے تعلق سے چند راہنما تحریریں ہیں، ناول کے تعلق سے سرورالہدیٰ نے چیکوسلوواکیہ کے میلان کنڈیرا کی ناول تنقید کا جائزہ لیا ہے گو یہ براہ راست مطالعہ پر مبنی نہیں لیکن بڑی محنت سے لکھا گیا ہے، اس مضمون سے یہ شمارہ اور بھی کار آمد بن گیا ہے۔ تنقیدی مضامین بھی موجودہ تنقیدی رویہ اور اسلوب کے عکاس ہیں۔ مثلاً پروفیسر قدوس جاوید کے مضمون کا آغاز ہی ان الفاظ کی ترکیب سے ہوتا ہے کہ ''اکیسویں صدی، انسانی تشخص کے بحران سے عبارت ہے اس بحران کے سبب اردو ناول کا مزاج، ٹھوس، مثالی اور وجدانی کی بجائے سیال، بصیرت مندانہ اور تعددی ہوگیا ہے''۔ بعد کی تجزیاتی تحریروں میں اس دعویٰ کا اثبات جیسا ہونا چاہیے نظر نہیں آتا۔ شعبہ اردو کے صدر اور شمارہ کے مدیر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی بہر حال مثبت فکر کے حامل ہیں جو دبے لفظوں میں یہ کہنے کے باوجود کہ معاصر ناولوں کے لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں وہ تمام صنفی تجربات ہیں جو مابعد جدید مغربی ناول کا حصہ ہیں۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ ظلم و جبر، صنفی و نسلی امتیازات، ثقافتی آمریت، فاشزم، ارذلیت اور سیاست کے مسائل کو جس طرح ناول کا موضوع بنایا گیا وہ روایت شکن ہے اور اس میں نئے امکانات روشن کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ مجموعی طور پر معاصر اردو ناول کے تعلق سے یہ محض مجموعہ مضامین ہی نہیں اعلیٰ تنقید و تجزیہ و تعارف پر مشتمل ایک وقیع وثیقہ ہے۔ ہمیشہ کی طرح حرف ابتدا ''آفاقی شان'' کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔

سہ ماہی اردو ادب، شاہ جہاں آباد نمبر۔ مدیر اعلیٰ: صدیق الرحمن قدوائی، مدیر: اطہر فاروقی۔ جنوری تا جون ۲۰۲۳ء قیمت فی شمارہ ۱۵۰ روپے، اس شمارہ کی قیمت ۱۰۰۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر ۲۱۲، راؤز ایوینیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔ ای میل: urduadabquarterly@gmail.com فون نمبر: 011-23237722

سہ ماہی اردو ادب کے مدیر اعلیٰ نے اپنے اداریہ میں لکھا بلکہ ایک طرح کا جد اماتم کیا کہ اردو کے اہم

ادبی پرچے اب صرف شاعری، افسانے اور تنقید تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور ان میں بھی تنقیدی تحریریں زیادہ ہیں، اردو تہذیب و ثقافت کی بو قلمونی ان رسالوں میں ماضی کی طرح دکھائی نہیں دیتی، شاید اسی لیے ارادہ کیا گیا کہ عظمت رفتہ کے نقوش کی تلاش و پیش کش میں عالم میں انتخاب شہر دہلی کا انتخاب کیا جائے۔ مدیر اعلیٰ نے تو دہلی کو جذباتی زندگی کا اہم موڑ اس لیے کہا کہ یہاں سے بہت کچھ نکلا اور آج بھی وہ تہذیب کے تسلسل کے طور پر زندہ ہے۔ اسی اجمال کی کچھ تفصیل یہ شمارہ ہے جس کے تین ابواب ہیں۔ شاہ جہاں آباد ایک تصویر کے سو رنگ، تین اہم ترین کتابیں اور شاہ جہاں آباد کی کہانی حویلیوں کی زبانی کے تحت بڑے سلیقہ سے شاہ جہاں آباد کی سیر کی گئی یا کرائی گئی ہے۔ لیکن یہ سیر محض قصہ سیر کہسار نہیں، فاضل مدیر نے کلمات ابتدائیہ میں واضح کر دیا کہ جو لکھا اور کہا گیا وہ تاریخ نویسی کے اصولوں کے مطابق ہے۔ سخن سازی اور افسانہ طرازی کا کہیں گزر نہیں۔ البتہ انہوں نے شاہ جہاں آباد کی تبدیلیوں کو فطری اور ناگزیر بتاتے ہوئے اچانک زور اس پر صرف کر دیا کہ شاہ جہاں آباد کے ایک معنی اردو کے بھی ہیں جو آخر آخر قلعہ معلیٰ میں بدل گیا، اردو کو لشکر کے معنی دینے والوں کو انہوں نے چائے خانوں سے متاثر بتایا۔ ان کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ اور انگریزی کے حلقہ بگوش اساتذہ کا ذکر بھی اسی لہجہ میں ہے۔ انگریزی داں مورخین کی اجارہ داری کا بھی شد و مد سے محاسبہ کیا گیا اور درد یہاں تک پہنچا کہ یہ جملہ آہ و کراہ کا نمونہ بن گیا کہ: ”یہ انگریزی داں مورخین کاروباری معاملات میں یہودیوں کو بھی پانی پلا سکتے ہیں“۔

اسی شدت جذبات نے ایک آن لائن تقریب ملاقات کا اہتمام کرادیا، جس کی سب سے بڑی کامیابی بقول فاضل مدیر پروفیسر عرفان حبیب کی شرکت تھی، ان کا افتتاحی خطبہ شامل اشاعت ہے اور ان کی شہرت کے مطابق ہی ہے۔ تصویر کے سو رنگ کے عنوان سے سات مضامین ہیں، اس لحاظ سے یہ باب ست رنگی ہے اور یہ شاید مانا جاتا ہے کہ سات رنگوں میں سارے رنگ سما جاتے ہیں۔ اسی طرح سیر المنازل، آثار الصنادید اور واقعات دارالحکومت، ان تین بنیادی کتابوں کا تعارف بھی دہلی کے تعلق سے عمدہ مطالعہ کی تصویر ہے۔ تیسرے باب میں پرانی دہلی کی حویلیوں کے بارے میں پون کمار ورما کے مضمون کا ترجمہ اطہر فاروقی کے قلم سے ہے، مضمون کی اپنی شان ہے لیکن سندیپ شنکر کی تصویروں نے گویا اوراق مصور کو زندگی عطا کر دی، قریب سوا سو صفحات پر مشتمل اس گوشے نے شمارہ کو بہت قیمتی بنا دیا، مدیر محترم نے جامع مسجد کے مینار کی سب سے اونچی منزل پر ڈھلتے ہوئے سورج کی تصویر کے متعلق خوب لکھا کہ یہ شاہ جہاں آباد کے زوال کا اعلامیہ ہے یا نئی صبح کی بشارت؟ کیمرے کی آنکھ،

بہر حال اس کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یقیناً فیصلہ کے لیے کسی خاص نظر کا انتظار کیا جانا چاہیے۔ ہم بھی اس شمارہ کو نایاب تحفہ کہتے ہیں، اس کی تیاری میں جو محنت کی گئی ہے اس کی داد بھی دل سے دینا چاہتے ہیں مگر اس محنت کے بارے میں یہ کہنا سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ محنت اس سے بس ذرا ہی کم ہے۔ جتنی پچاس برس تک ظفر اقبال کو غالب سے بڑا اور فراق کو احمد مشتاق سے چھوٹا ثابت کرنے کے لیے اردو والوں نے کی۔ اردو والوں کا یہ "عموم" بجا طور پر شکوہ کناں ہو سکتا ہے۔

سہ ماہی ساغر ادب۔ یو جی سی کیر لسٹ جرنل (جنوری تا مارچ ۲۰۲۲ء) مدیر اعلیٰ پروفیسر سید آل ظفر، مدیرہ: کہکشاں یاسمین، قیمت ۳۰۰ روپے، سالانہ ۱۲۰۰ روپے، پتہ: ساغر ادب، حسینیہ ہاؤس، زکریا کالونی، محلہ سعد پورہ، پوسٹ رمنہ، مظفر پور۔ ۸۴۲۰۰۲ بہار موبائل: ۹۴۳۰۰۸۴۲۶۱

یہ رسالہ یو جی سی کیر لسٹ میں شامل ہے۔ شاید اسی لیے ستر مضامین میں تیس مضامین ریسرچ اسکالرز ہی کے ہیں، باقی چالیس مضامین ان اہل قلم کے ہیں جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ مضامین کا تنوع ظاہر ہے، ستر تحریریں ہیں، ہر ایک کا موضوع الگ، شخصیات، شعر، ادب، تعلیم، افسانہ، ناول، قومی یکجہتی، عورت کے وجودی مسائل وغیرہ موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ اداریہ میں کہا گیا کہ یہ شمارہ فیض کے لیے مخصوص ہے، لیکن یہ اختصاص صرف اداریہ ہی تک ہے جس نے آخر یہ اعلان کر دیا کہ فیض رنگ سخن اور اظہار اور اسلوب کے اعتبار سے اپنے عہد کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ بعض مضامین موضوعات کی جدت لیے ہوئے ہیں، جیسے دلت افسانہ نگاری کا اہم ستون اور اردو شاعری میں عورت کے وجودی مسائل، بعض پامال مضامین میں بھی تازگی ہے، جیسے غالب شاعر محشر خیال اور آغا حشر کے محققین و ناقدین وغیرہ۔ باقی طلبائے تحقیق کے مضامین سے موجودہ دور کی تحقیقی پیش رفت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مضامین کا معیار جو بھی ہو، قابل تعریف، رسالہ کے مدیر اور ان کے رفقا کی محنت ہے۔ قریب چار سو صفحات کا رسالہ نکالنا یوں بھی آسان نہیں، پھر اس کو صاف ستھرا اور دیدہ زیب بنانے میں محنت کے ساتھ شوق فراواں کی ضرورت ہوتی ہے، ساغر ادب کو معنویت عطا کرنے میں یقیناً مدیر سید آل ظفر نے ہر ممکن کوشش کا عملی اظہار کر دیا، ساغر ادب سے لطف اندوز ہونا ہی چاہیے۔

جرنل آف لا اینڈ ریلیجیس افیرز، جلد اول شمارہ ۲، چیف ایڈیٹر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، قیمت درج نہیں، سال اشاعت ۲۰۲۲ء پتہ: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ۱/ اے، ۷۶، مین مارکیٹ اوکھلا گاؤں، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵۔ ای میل: jiraarmplb@gmail.com

مسلم پرسنل لابورڈ کا یہ رسالہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہے، زیر نظر شمارہ میں اردو کے ۹۱ اور انگریزی کے ۱۲۴ صفحات ہیں، اردو اداریہ نگار محمد عمر نے ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں اس رسالہ کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بتایا کہ آیندہ نسل کے لیے اس کی اہمیت آرکائیوز کی سی ہو اور یہ حوالہ کا کام دے سکے۔ انگریزی اداریہ ایم آر شمشاد نے حجاب اور وقف جیسے مسائل میں بنیادی اور ٹھوس دلائل کے لیے حوالہ جات کی معتبر ضرورت، اور عربی اور اصل مصادر کے انگریزی ترجموں کی استنادی حیثیت پر گفتگو کی ہے کہ ان مسائل پر علما اور اہل فکر و نظر کے اظہار خیال کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے ،اور اس رسالہ کے چند خاص مقاصد میں اس ضرورت کی تکمیل بھی ہے۔

ڈاکٹر آفاق ندیم خاں کی ایک تحریر آئین ہند میں تعلیم سے متعلق اہتمام کے عنوان سے ہے، مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر یہ اچھی کاوش ہے۔ بعض اہم مقدمات کے فیصلے بھی ہیں اور آسٹریلیا میں مسلمانوں کے معاشرہ میں خاندانی تنازعات سے متعلق خواتین کے تجربات کے عنوان سے ایک نہایت دلچسپ باب ہے جس میں طلاق کا عمل، اس میں خواتین کے شامل ہونے کے اسباب، ان کے تجربات اور پھر ان تجربات کی روشنی میں طلاق کے عمل کو بہتر بنانے کی سفارشات جیسے مسائل پر عمدہ تحقیق ہے۔ خواتین کے لیے جو اسباب طلاق ہیں، ان سے بھی ہندوستان اور آسٹریلیا کے سماجوں کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ وہاں مذہبی اور روحانی اسباب میں جذباتی استحصال کو ختم کرنے کی ضرورت بھی ایک وجہ ہے، معاملہ کو حتمی شکل دینا اور کمیونٹی کے اندر بدنامی سے بچنے کی خواہش جیسے اسباب بھی ہیں جو اس مسئلہ طلاق کو کچھ اور ہی سیاق وسباق میں دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک مضمون حجاب کے تعلق سے ہے اور مولانا رحمانی کے قلم سے ہے اس لیے اس کی افادیت ظاہر ہے۔

انگریزی حصہ میں ایس رضی شیخ کی تحریر انیسویں صدی میں دیوبند تحریک اور الٰہیاتی قانون کی برتری اور اپرنا اچاریہ کا مضمون لو جہاد ہے، فیصل فصیح کے ایک مضمون کا سوالیہ عنوان ہے کہ کیا شادی محض پارٹنرشپ ہے؟ یہ سوال کریمنل لا سے کیا جانا چاہیے، ایک اور حصہ میں حجاب کے معاملہ میں پرسنل لا بورڈ کی اسلامی پوزیشن کے تعلق سے رپورٹیں ہیں۔ جرنل کے متعلق جسٹس بدر درریز احمد کی یہ امید بجا ہے کہ مسلم پرسنل لا کے تعلق سے کافی غلط فہمیاں ہیں اور یہ جھوٹ اور جعلی مواد کا نتیجہ ہیں۔ جرنل ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے میں یقیناً مددگار ثابت ہوگا۔ (ع۔ص)

تبصرہ کتب

حضرت مولانا ابو سلمہ شفیع احمد (حیات و خدمات و مشاہدات): مرتب مولانا طلحہ بن ابو سلمہ ندوی متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۵۲، قیمت درج نہیں، پتہ: ادارہ ترجمہ و تالیف 28/H/15 سر سید احمد روڈ، کولکاتا۔۱۴، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، فون: ۶۲۹۱۱۱۰۷۱۷

گذشتہ صدی میں کلکتہ کی علمی و مذہبی دنیا جن ہستیوں سے آباد تھی ان میں ایک ممتاز نام مولانا ابو سلمہ شفیع احمد کا تھا، وہ علماء کی صف میں اگر سرفہرست تھے تو وجہ تھی کہ ایک جانب وہ عام طبقے کا مقبول ترین حصہ تھے، عیدین کی امامت و خطابت نے ان کو جو خاص درجہ عطا کیا تھا اس کو انہوں نے عوام کی خدمت کا غیبی اشارہ سمجھا۔ اصلاح معاشرہ کے لیے انہوں نے تحریر و تقریر کے ذریعہ پورے بنگال میں ایک تحریک سی پیدا کردی۔ اس کی کامیابی میں ان کی سادہ زندگی اور ریا و نمود سے پاک عمل نے بڑا اہم کردار ادا کیا، دوسری طرف دیوبند سے فراغت اور کبار علمائے دیوبند سے تعلق اور مدرسہ عالیہ میں تفسیر و حدیث کی تدریسی خدمت اور ادارہ ترجمہ و تالیف کے ذریعہ نہایت اعلیٰ درجہ کے تحقیقی کاموں کی وجہ سے خواص میں بھی اسی درجہ قبولیت اور احترام ان کو حاصل ہوا۔ امام بیہقی کی کتاب معرفۃ السنن والآثار، ابن قتیبہ کی کتاب المعارف جیسی کتابوں کی تعلیق و تصحیح اور ترجمہ سے مولانا کی علمی عظمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے بعض نہایت بیش قیمت مقالات کا ایک مجموعہ بھی انہوں نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ باقی مسلمانوں کے وقتی مسائل جیسے یکساں سول کوڈ، ختم رسالت اور خطبات عیدین جیسے رسالے برابر شائع کرتے رہے۔ ان کی ایسی قابل زندگی اور متاع زندگی کو یاد کرنا یقیناً نام نیک رفتگاں کو ضائع نہ ہونے دینے کا قابل تعریف و تقلید فریضہ ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ ان کے سعید و صالح جانشین صاحبزادے نے اسی فریضہ کو انجام دیا۔ برصغیر کے جید علماء جنہوں نے مولانا ابو سلمہؒ کے تعلق سے جو کچھ قلم کے سپرد کیا، اس کتاب میں بڑے سلیقے سے وہ سب جمع کر کے پیش کردیا گیا۔ مولانا کے بعض اہم مضامین و مکتوبات، ان کے ادارہ کا تعارف، منظوم خراج عقیدت اور اکابر معاصرین کے تاثرات بھی یکجا کردیئے گئے۔ مضامین سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں لیکن مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے جس جامعیت سے مولانا کی کتابوں اور مضامین کا تعارف کرایا ہے۔ اس سے اس مجموعہ کی افادیت بہت بڑھ گئی، ایک مضمون ایسے خام قلم سے ہے جو محض محبت کی بنا پر شامل کتاب ہے لیکن کتابت کی غلطیوں سے وہ اس درجہ داغ دار ہے کہ شامل نہ کیا جانا ہی بہتر ہوتا۔ کتاب کے نام میں شیریں زباں مفسر قرآن بھی شامل ہے، یقیناً مولانا ابو سلمہ کے قرآنی دروس نے ان کی زبان

کو شیریں سخنی کی نعمت بھی عطا کی تھی۔ بزرگوں کے ایسے حالات کو اب پھر سے دیکھنے اور پڑھنے کا تقاضہ شدید ہونا چاہیے۔ طلحہ بن ابو سلمہ نے صرف آداب فرزندی کا ہی حق ادا نہیں کیا، یاد کیے جانے کے اجر کو بھی عام کر دیا۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات: از جناب اقبال حیدر ندوی، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۵۶، قیمت ۲۰۰ روپے، سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء، پتہ: مصنف استھانواں، ضلع نالندہ، بہار، اور پٹنہ نئی دہلی اور لکھنؤ کے مشہور مکتبے، موبائل: ۸۶۵۱۱۵۵۵۰۳

سرزمین علم و دانش نالندہ کی مردم خیزی آج بھی جاری ہے، ثبوت میں اس مفید کتاب کے مصنف کا نام لیا جاسکتا ہے، وہ ابھی جواں سال ہی کہے جائیں گے لیکن انہوں نے اس مدت میں ہندو بیرون ہند، امامت و خطابت کے ذریعہ اپنی پہچان بنائی اور ساتھ ہی قلم و قرطاس سے تعلق بھی قائم رکھا، ملک کے بعض ممتاز علمی و ادبی رسالوں میں وہ برابر چھپتے رہے، چھوٹے چھوٹے لیکن بڑے کام کے مضامین ان کے قلم سے آتے رہے، اس کتاب میں انہوں نے ان مضامین کو کئی عنوانوں کے تحت جمع کر دیا۔ اسلامیات، اخلاقیات، شخصیات، سائنسی علوم اور صحت و تندرستی یہ عنوانات ہیں جو لکھنے والے کے تذکیری عمل اور اس کی نافعیت کے آئینہ دار ہیں۔ ساتھ ہی ان مضامین کی زبان بھی دانستہ نہایت آسان سلیس رکھی گئی ہے۔ آسان لفظوں میں مشکل مضامین کو بیان کرنا واقعی ہنر ہے۔ صحیح کہا گیا ہے کہ مصنف اس باب میں ہنر مند ہیں۔ قرآن مجید، سیرت نبی رحمت، معراج، رمضان، خوف خدا جیسی مذہبی باتیں ہوں یا ماں کی گود، معاشرے کی تشکیل، بیٹی، دلہن، سسرال، اولاد کی اصلاح جیسی اخلاقی تعلیمات ہوں، ہر تحریر پڑھنے والے کے لیے افادیت ہی رکھتی ہے، شخصیات میں اویس قرنی، مولانا جوہر، مولانا علی میاں وغیرہ کا ذکر ہے۔ لیکن مصنف کے نانا سید فصیح احمد کا ذکر قدرتاً زیادہ تفصیل سے ہے، وہ تھے تو بہار کے لیکن مدھیہ پردیش کا مشہور شہر سرونج ان کے علم و فضل کے فیضان کا سب سے بڑا حصہ دار رہا۔ ان کے قیام سرونج کی داستان بھی تمام مضامین کی طرح دل میں اتر جانے والی تاثیر رکھتی ہے۔ مصنف یقیناً تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

اسفارِ نبوی: مرتب مولانا انتخاب عالم اعظمی، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۳۶۰، قیمت ۳۰۰ روپے، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، پتہ: مکتبہ رشیدیہ، جامعہ رشیدیہ، بمہور، اعظم گڑھ اور دیوبند اور سرائے میر کے مکتبے۔ موبائل: ۹۹۱۸۸۱۶۶۷

حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں، علامہ اقبال کی اس بات نے غالباً لائق مصنف کی ایسے موضوع

کی جانب رہنمائی کی جس پر مستقل اور جداگانہ کوئی بڑا کام نہیں ہوا، رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ میں حیات انسانی اور اس کے ہر پہلو کی موجودگی بجائے خود معجزہ ہے۔اسی میں آنحضورﷺ کے اسفار بھی شامل ہیں۔ نبوت سے پہلے یثرب وشام کے سفر تو معروف ہیں لیکن بعض روایتوں کے مطابق آپ ﷺ نے یمن اور بحرین کا سفر بھی کیا۔ مصنف نے اس عنوان میں توسیع سے کام لیتے ہوئے طائف اور معراج کو بھی شامل کردیا،واقعہ ہجرت بھی سفر میں آگیا اور پھر جتنے غزوات ہوئے، سفر کی معنویت سے ان سب کو اسفار نبویؐ میں شامل کردیا گیا، حتی کہ سفر آخرت کو بھی اس عموم میں شامل کرلیا گیا۔ساتھ ہی سفر کے آداب اور دعاہائے سفر کو بھی نقل کرکے کتاب کی افادیت میں اور اضافہ کردیا گیا۔ حوالوں کا بھی اچھا اہتمام ہے ۔ مولانا ارشد مدنی ، مفتی محمد راشد اعظمی ، مولانا محمد رضوان قاسمی، مولانا عارف جمیل اور مفتی محمد صادق مبارکپوری نے مصنف کی عرق ریزی اور موضوع کی انفرادیت وافادیت کی داد دی ہے۔اس داد میں ہم بھی شامل ہیں۔

ع۔ص

المختار من وفیات الاعیان لاحمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان: د/محمد فرمان الندوی، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش ۔صفحات: ۱۸۴۔ ملنے کا پتہ: مؤسسۃ الصحافۃ والنشر ندوۃ العلماء، لکناؤ، الھند۔ قیمت: ۱۸۰روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل وای میل: درج نہیں۔

وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، شمس الدین احمد بن محمد معروف بہ ابن خلکان کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ عربی کے تاریخی ادب میں اس کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسری کتاب کے حصہ میں نہیں آئی۔ یہ کتاب ہر زمانہ میں اہل علم وادب کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔تاریخ اسلام کے سوانحی تذکروں میں شاید ہی کوئی کتاب ہو جس میں اس کا حوالہ نہ ہو۔اس کی وجہ غالبا یہ ہے کہ اس میں امت کے تمام طبقات محدث، مفسر، فقیہ، فلسفی، ادیب، شاعر، مؤرخ، سیرت نگار، تذکرہ نگار، حکیم، صوفی، نحوی، سیاسی شخصیات کا تذکرہ انتہائی جامع انداز میں کیا گیا ہے۔اسی لیے ہر طبقہ کے محققین نے اس کتاب سے استفادہ کیا اور اس کا حوالہ بھی دیا۔اس طرح یہ اپنے موضوع پر مرجع اور انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔

زیر نظر کتاب اسی کتاب کا ایک عمدہ انتخاب ہے جو ندوۃ العلما کے نصاب کا حصہ ہے۔اس انتخاب کو پانچ جلی عناوین علماء ربانیین، محدثین و فقہا، ادبا و مؤرخین، شعرا، ملوک ووزرا کے تحت تقسیم کرکے بالترتیب حسن بصری، غزالی، امام ابوحنیفہ، احمد بن حنبل، ابواسحاق شیرازی، امام الحرمین،

اسفرائینی، ابن قرقول، ابن الماجشون، ابوالفضل بن العمید، صاحب بن عباد، ابوالطاہر سرقسطی، یاقوت حموی، ابوتمام، البحتری اور نظام الملک، نورالدین، شاہ سلجوقی، سیف الدولہ بن حمدان کے حالات شامل کیے گئے ہیں۔

شروع میں "وفیات الاعیان، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نظر میں" کے عنوان سے ڈھائی صفحہ کی ایک مفید تحریر ہے جس میں کتاب وصاحب کتاب کے علمی وادبی مقام مرتبہ کا جامع خاکہ کھینچا گیا ہے۔اس کے بعد مولانا سید محمد رابع ندویؒ، مولانا سید واضح رشید ندویؒ اور مولانا سعید الاعظمی ندوی کے مقدمات ہیں۔پھر مؤلف کے قلم سے کلمات تشکر کے تحت شروع میں اس کتاب کی ترتیب، ابن خلکان کے اسلوب، کتاب کی علمی، ادبی، تاریخی اہمیت اور سبب تالیف کا مجملا ذکر ہے۔ ص ۲۳ سے ۳۷ تک ابن خلکان کی حیات وخدمات کا محققانہ تذکرہ طلبہ کی رعایت میں بڑے سادہ ودلنشین اسلوب میں کیا گیا ہے۔بعض شخصیات کے ذیل میں وضاحتی نوٹ اور حواشی کے اضافہ نے کتاب کی افادیت بڑھادی ہے۔البتہ متعدد جلدوں پر مشتمل اتنی اہم اور ضخیم کتاب سے چند شخصیات کی وجہ انتخاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا کیا گیا ہے۔بعض ہم عصر شخصیات کے تذکرہ میں زمانی ترتیب کالحاظ نہ جانے کیوں نہیں کیا گیا ہے۔

تحقیق وتلاش: ابوالکلام رحمانی، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گردپوش، صفحات ۱۰۴، ملنے کا پتہ: معین وقار رحمانی q-510 محلہ بیگن، مٹیابرج، کولکاتا ۷۰۰۰۲۴۔ قیمت: ۳۰۰روپے۔ سنِ طباعت ۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر: ۹۷۴۸۵۸۲۸۵۳ ای میل: درج نہیں۔

مصنف کا علمی وادبی سفر ۴۰ سال قبل شروع ہوا۔سب سے پہلے "اس حمام میں" (انشائیوں کا مجموعہ) منظر عام پر آیا۔اس کے بعد انشائیوں کے مزید دو مجموعے شائع ہوئے۔دو تحقیقی کتابیں تذکرہ مشاہیر ادب، شیخ پورہ وتذکرہ مشاہیر ادب، مشرقی مگدھ بھی زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ان کے علاوہ ناولوں، افسانوں اور تحقیقی وادبی مضامین کے متعدد مجموعے ان کے نام کی شہرت کا سبب بنے۔زیر نظر کتاب مصنف کے ان چودہ ادبی، تحقیقی، تنقیدی اور بعض تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں کچھ تو مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوچکے اور اکثر غیر مطبوعہ ہیں۔بعض ایسے اشخاص پر قلم اٹھایا گیا ہے جن پر اب تک کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے۔اس سے ان کی علمی وسوانحی ترجیحات کا اندازہ ہوتا ہے۔مولانا معصومی کی شہرت عالم دین اور عربی زبان وادب کے ناقد کی حیثیت سے عالم گیر ہے لیکن کتاب میں اردو ادب کے محقق اور تنقید نگار کی حیثیت سے بجاطور پر متعارف کرایا گیا ہے۔"پریم چند کی

کہانیوں کے مسلم کردار'' کا تنقیدی جائزہ شواہد کی بنیاد پر لیا گیا ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کے متعلق پریم چند کی ذہنیت پر جو سوالات اٹھائے ہیں ان کا جواب آسانی سے نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح ''اپنچ کے گرو گھنٹال'' میں فرضی نام گرو گھنٹال یعنی مولانا نبی احسن کا انکشاف مصنف کی تلاش و تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے۔ انیس النبی کے افسانوی مجموعہ ''پرندے'' کا مطالعہ بھی دقت نظری سے کیا گیا ہے۔ فن تاریخ گوئی میں مغربی بنگال کے بزرگ شاعر سفیر الدین کمال کے کمالات بھی دکھائے گئے ہیں اور نزول قرآن، فتح مکہ، فرضیت روزہ، حجۃ الوداع وغیرہ جیسے ارکان اسلام اور اردو کے بعض نمایاں اشخاص و اعلام پر کہی گئی تاریخوں کے نمونے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مضامین سب کے سب بہت کام کے ہیں۔ آخری مضمون''، معین رحمانی۔ مستقبل کی امید'' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں معین رحمانی صاحب کی انشائیہ نگاری کی حوصلہ افزا تعریف کی گئی ہے۔

متنوع موضوعات پر مضامین کے اس مجموعہ سے مصنف کے علمی وادبی ذوق کی متانت، سلالت، اردو زبان وادب پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سوانح، تذکرہ، خاکہ اور مرقع نگاری کا فن بظاہر ایک ہی طرح کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن ان میں بنیادی طور پر بڑا فرق ہے۔ صاحب کتاب نے ان مقالات میں اس فنی نزاکت کا خاص خیال رکھا ہے۔ زبان سلیس و رواں اور صاف ستھری استعمال کی ہے۔ کتاب لائق مطالعہ ہے۔

عصری تعلیمی ادارے مسائل واحکام: مفتی سید باقر ارشد، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۲۰۸۔ ملنے کا پتہ: المفتی ریسرچ، اسٹڈی سرکل اینڈ پبلی کیشنز #۷۴۸ محلہ مفتیان، ایس وائی مفتی روڈ، نظامی چوک چنا پٹنا ۵۶۲۱۶۰، ضلع رام نگر (بنگلور رورل) کرناٹکا انڈیا۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء ۔ موبائل نمبر: ۹۸۴۵۳۶۷۴۴۳۔ ای میل: muftiarshed@gmail.com۔

دور حاضر کے جدید مسائل، عصر حاضر کے سلگتے مسائل، ماحولیاتی آلودگی۔ مسائل واحکام، ضعیفوں کے حقوق۔ مسائل واحکام کے نام سے کتابیں تصنیف کرکے مصنف نے نہ صرف علما کے حلقہ میں اپنی الگ شناخت قائم کرلی ہے بلکہ ان مسائل پر گہری نظر کا ثبوت بھی بہم پہنچایا ہے۔ امت میں ایسے علما کی کمی نہیں ہے جن کی مسائل پر نظر نہ ہو لیکن مسائل کا حل پیش کرنے والے علما گنتی کے ہی ملیں گے۔ صاحب کتاب کا شمار انہیں معدودے چند علما میں ہیں جنہوں نے مسائل کا دین و شریعت کی روشنی میں حل پیش کیا ہے۔ اس وقت ملت اسلامیہ کے علمی، تعلیمی، مذہبی و ثقافتی تشخص کو ختم کرنے کی

عالمی بالخصوص ملکی سطح پر جس قسم کی کوششیں ہورہی ہیں اگر ان کا دینی حل سامنے نہیں آیا اور ملت بیدار نہیں ہوئی تو اس کی تباہی طے ہے۔ مصنف ان تمام مسائل کا حل صحیح تعلیم سے دلچسپی و فرغ میں سمجھتے ہیں۔

ان کے مطابق مسلمانوں کے لیے دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کا حصول ضروری ہے مگر ان کے پاس ان کی ضرورت کے مطابق عصری تعلیمی ادارے بھی نہیں ہیں۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے مسلمان طلبہ ان ملکی عصری تعلیمی اداروں کا رخ کرتے ہیں جہاں کا ماحول اور پورا نظام تعلیم غیر اسلامی ہے اور ان طلبہ و طالبات کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لائق مصنف نے زیر نظر کتاب میں بعض ایسے چشم کشا حقائق پیش کیے ہیں جن سے مسلم دانشور طبقہ بھی واقف نہیں ہے۔ انتہائی تفصیل سے ان تعلیمی اداروں کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے اور ان میں موجود مسائل کا شرعی و دینی حل پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس پورے نظام کا حصہ رہ کر بھی خود کو کیسے آٹے میں بال کی طرح بحفاظت نکالا جاسکتا ہے۔ یہی اس کتاب کا سب سے مفید پہلو ہے جو قاری کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ پہلے یہ مقالہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے ایک فقہی سیمینار منعقدہ حج ہاؤز، ممبئی کے لیے لکھا گیا۔ بعد میں مزید اضافہ کرکے اس کو عام استفادہ کے لیے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ مصنف نے کوئی بات بغیر حوالہ کے نہیں کہی ہے۔ اسلوب علمی اور ادبی اختیار کیا گیا ہے۔ کتاب اپنے موضوع پر بھرپور مواد کی حامل اور عصری و دینی دونوں اداروں کے اساتذہ، طلبہ، انتظامیہ اور عام ارباب تعلیم کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

ضرب تبسم: عابد رضا عابد (ابن واہی)، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۲۷۲۔ ملنے کا پتہ: بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۴۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔ سن طباعت: 2019ء، موبائل نمبر ۷۵۴۳۰۲۱۸۶۶۔ ای میل درج نہیں۔

اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت قدیم ہے۔ اس لطیف صنف سخن سے فرد و معاشرہ کی اصلاح کے بڑے بڑے کام لیے جاتے رہے ہیں۔ لیکن فنی لحاظ سے یہ بہت مشکل کام ہے، سب کے بس کا نہیں ہے۔ اچھا اور سچا ظریف الکلام شاعر معاشرہ کی دکھتی رگ پر انگلی اس انداز سے رکھتا ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ زیر نظر مجموعہ کلام میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ شاعر حقیقت پسند اور فرد و معاشرہ کی اصلاح کا خواہش مند ہے۔ اسی لیے اس نے نظموں، غزلوں اور قطعات کے لیے جن موضوعات و عناوین کا انتخاب کیا ہے ان کا تعلق اخلاقی برائیوں، سیاسی بد دیانتیوں اور علمی و ادبی

خیانتوں سے ہے جو نام نہاد اور مہذب سماج و معاشرہ میں موجود ہیں۔انعام جو ملا نہیں، چمتکار، شاعروں کی سنامی، لیلائے کرپشن، وقف کی لوٹ، بڑھاپے کا کرب، جنتا جاگ چکی ہے، خطرے میں چاند، چاند پر پانی، چناؤ یا جنگ، درد اردو، دل بدلو، بوفے ڈنر، غیبت کدہ، ظلم کی آگ، نوٹ بندی، شراب بندی وغیرہ میں ہر عنوان سماج و معاشرہ کی بد عنوانیوں کا مظہر ہے اور شاعر نے پورے اخلاص نیت کے ساتھ ان نظموں میں سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ان کے مشاہدہ میں جو خامیاں نظر آئیں، نہایت خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے ان کی جانب اشارہ کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ شاعر عابد اپنا اثر چھوڑنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ان کا مقصد یقیناً اصلاح ہے کسی کی توہین و حقارت نہیں۔زیر نظر چند اشعار پڑھ کر کس کا دل مائل بہ اصلاح نہیں ہو گا۔

صبح ہوتی نہیں اذانوں سے ۔۔۔ اب یہ ہوتی ہے گیت گانوں سے
کوئی مطلب نہیں نمازوں سے ۔۔۔ آ کے تو ہی بچا گناہوں سے
کردے آگاہ بھی سزاؤں سے

بعض مقامات پر وزن و عروض کی ہلکی پھلکی خامیاں بھی نظر پڑیں۔خوش الہانیوں (الحانیوں) اور حدف (ہدف) جیسی فاش غلطیاں بھی در آئی ہیں۔لیکن ان معمولی کمیوں سے اس کی خوبیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ضرب تبسم کی ہر نظم نے معاشرہ پر جس طرح ضرب لگائی ہے وہ قابل تحسین ہے۔یہ مجموعہ مزاحیہ شاعری کے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ **ک، ص اصلاحی**

بزم دانش وراں: از ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، صفحات ۳۵۲، قیمت ۴۲۵ روپئے، سال اشاعت: ۲۰۲۱، طابع و ناشر: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، ملنے کا پتہ: دار الفہیم پبلی کیشنز مئوناتھ بھنجن (یوپی)

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی سابق کارکن دارالمصنفین اردو کے صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ وہ ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کے علمی مجلہ ''الرشاد'' کے مدیر ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب ڈاکٹر صدیقی کے ان منتخب مضامین کا مجموعہ ہے جو الرشاد میں قسط وار شائع ہو چکے ہیں۔یہ کتاب سوانحی ادب میں ایک اضافہ ہے۔کتاب کا مقدمہ مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کے قلم سے ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"۔۔۔بزم دانش وراں'' اہم دینی، علمی، ادبی، اور اصلاحی شخصیات کے احوال کو پیش کرتی ہے، جس میں ملت کے مختلف طبقات کے اہم لوگوں کا تذکرہ ہے، اور یہ سب وہ لوگ ہیں جن کا انہوں نے زمانہ پایا اور ان کو دیکھا اور پڑھا ہے''۔ص (۸)

اس کتاب میں ۳۶ اہل علم ودانش کی ایک خوب صورت بزم سجائی گئی ہے۔بقول مولانا سعید الرحمن اعظمی کے ''اس کی فہرست اَعلام پر نظر ڈالیے تو اس کے اندرون کے بیش بہا موتیوں کا ایک سرسری اندازہ ہو جائے گا''۔ ص(۱۱)

اس کتاب کا آغاز مولانا عبدالباری ندویؒ کے تذکرے سے ہوا ہے اور اختتام ہاشم انصاری مرحوم بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے اہم رکن پر ہوا ہے۔کتاب میں جن مشاہیر کا ذکرِ جمیل ہے ان میں مولانا عبدالسلام ندویؒ، علامہ اقبال احمد خان سہیلؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، سید صباح الدین عبدالرحمنؒ، ماہر القادریؒ، مولانا عبدالغنی پھول پوریؒ، مفتی عبد اللہ پھول پوریؒ، مولانا محمد الحسنیؒ، مولانا صفی الرحمن مبارک پوریؒ، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اور حاجی عبدالرزاق کالسیکر مرحوم شامل ہیں۔

ڈاکٹر مولانا صدیقی اپنے معنوی استاد ماہر القادریؒ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

> ماہر القادری شعر وادب میں زبان وبیان اور اظہار وابلاغ (Expression) کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے، ان کے نزدیک بلند سے بلند خیال اور نازک سے نازک تخئیل و فکر کے اظہار کے لیے اگر مناسب و موزوں الفاظ نہ ملیں تو خیال و فکر کی بلندی خاک میں مل جاتی ہے، اور تخئیل کا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ماہر صاحب کا خیال تھا کہ شاعر اور ادیب کو زبان پر غیر معمولی قدرت ہونی چاہئے۔جس شاعر اور ادیب کی زبان کمزور ہے، اس کا ادب اور شاعری بھی کمزور ہے۔ (ص ۶۳)

ایسے ہی علامہ اقبال سہیل مرحوم کے بارے مولانا صدیقی نے لکھا ہے:

> عاجز کی رائے میں اقبال سہیل کے تاج عبقریت کا دُرِّ آب دار ان کی عدیم المثال ذہانت و فطانت تھی۔اس صفتِ خاص میں ان کی نظیر معاصرین میں کمیاب تھی۔۔۔استاذی شاہ معین الدین ندوی نے بھی دنیائے ادب کے اس عظیم خسارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ علمی قابلیت اور ذہانت کے لحاظ سے غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے، مگر وکالت کے پیشہ نے ان کے جوہر کو چمکنے نہ دیا۔اگر وہ کسی علمی شعبے میں ہوتے تو ہندوستان کے مشاہیرِ اہل علم میں ان کا شمار ہوتا۔(ص109)۔

بہ حیثیت مجموعی کتاب لائق مطالعہ ہے۔امید کہ علمی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

(فضل الرحمن اصلاحی)

ادبیات

نعت

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

موبائل:۹۸۹۷۸۲۰۷۷۷

صبح کی روشنی شام کی روشنی ، روز و شب آپؐ کے نام کی روشنی
آفتابِ رسالتؐ کے پرتو سے ہے سارے عالم میں اسلام کی روشنی
روشنی جس کو کہتے ہیں اہل جہاں، روشنی ہے وہ بس نام کی روشنی
جس میں آقاؐ کی سیرت نہ ہو ضوفشاں، دوستو! ہے وہ کس کام کی روشنی
انقلابات عالم میں لائے گئے ، طرز جینے کے کیا کیا بتائے گئے
راہبر کتنے دنیا میں آئے گئے ، اب ہیں وہ جملہ ایّام کی روشنی
وہ مدینے کی گلیاں ہیں کیا دل ربا ، دن میں چلتے تھے وہ فخر ارض و سما
جن میں آقاؐ کا روضہ ہے جلوہ نما ، مرحبا ان درو بام کی روشنی
روشنی تاقیامت جو درکار ہو ، میرے آقاؐکے نقشِ قدم پر چلو
جس پہ تم ناز کرتے ہو اے غافلو ! یہ تو ہے ایک دو گام کی روشنی
اُن کے اصحابؓ سے جن کو الفت نہیں، ان کی آنکھوں میں شاید بصارت نہیں
ہے صحابہؓ کی کوشش سے پھیلی ہوئی ، ہر طرف اُن کے پیغام کی روشنی
مدحِ محبوب داورؐ کے فیضان سے ، میرے الفاظ کوثر بہ داماں ہوئے
میرے شعروں میں نکہت ہے ایمان کی ، میری نعتوں میں الہام کی روشنی
یہ رئیس حزیں جب تلک بھی جیئے ، اے خدا ، اُن کی طاعت کی توفیق دے
نام سے اُن کے روشن رہیں اس کے لب ، اور دل میں اسی نام کی روشنی

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبر وار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ/صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھا لیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا گیا ہے۔

۱۲۔ مضمون نگار حضرات مسلمانان ہند کے سیاسی، تہذیبی، سماجی اور لسانی موضوعات پر بھی توجہ دیں۔

رسید کتب موصولہ

آثار شیراز ہند (جونپور): حاجی ضیاء الدین ، منیچھا، کھیتا سرائے، جون پور۔ صفحات ۳۰۴، سال اشاعت ۲۰۲۳، قیمت ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۳۶۴۴۴۰۷۲۔

انساب وامصار: ڈاکٹر امام اعظم، بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔ صفحات ۱۵۲، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۸۹۰۲۴۹۶۵۴۵۔

جواہر القرآن (حصہ اول، پارہ: ۱-۵): قاضی اطہر مبارک پوری، ترتیب مفتی محمد صادق مبارک پوری، قاضی اطہر اکیڈمی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ۔ صفحات ۵۹۲، سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر درج نہیں۔

دراسۃ المناکیرعند الامام ابی داؤد فی سننہ (عربی): عبدالرشید الندوی، مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ۔ صفحات ۳۰۴، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر درج نہیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے تفسیری نکات (جلد دوم): محمد فرمان ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۴۵۰ روپے ، E-mail: info@arip.org.in

فتاویٰ دارالعلوم وقف، دیوبند (جلد ۵): ترتیب لجنۃ ترتیب الفتاویٰ، حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند۔ صفحات ۵۱۸، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۰۷۶۷۲۶۔

فتاویٰ علیمیہ: مفتی عبدالعظیم اعظمی، ترتیب مفتی فرحت افتخار قاسمی، مکتبہ عکاظ، دیوبند۔ صفحات ۴۹۶، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۹۸۴۶۰۴۷۷۸۔

قطرات من القلم (عربی): محمد نعمان الدین الندوی، جامعہ الہدایہ، جے پور۔ صفحات ۲۴۸، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۰۴۴۴۹۴۰۹۹۔

مفتی محمد حنیف جونپوری-حیات وآثار: مولانا ابن الحسن قاسمی، مدرسہ اسلامیہ عربیہ بیت العلوم سرائمیر، اعظم گڑھ۔ صفحات ۵۲۰، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۵۰۰ روپے ، موبائل نمبر: ۹۴۱۵۸۶۵۰۰۱ ۔

مقالات رشید حسن خاں (جلد چہارم): ڈاکٹر ٹی-آر-رینا، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ (بہار)۔ صفحات ۵۴۴، سال اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت ۵۳۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۹۸۲۸۵۴۲۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	250/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print JUL 2023 Vol. 210/07

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org